انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

حیاتِ نو

مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

جلد:۲۸، شمارہ:۳، جولائی- ستمبر ۲۰۱۴ء/شعبان المعظم- ذی القعدہ ۱۴۳۵ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی .... جامعۃ الفلاح

سید راشد حامدی فلاحی ...... نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی .... لکھنؤ

انیس احمد فلاحی .... جامعۃ الفلاح

فی شمارہ	:اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون	:اندرون ملک	۱۲۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	:اندرون ملک	۳۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

خط وکتابت کے پتے

برائے ادارتی امور
ابوالاعلیٰ سید سبحانی، نئی دہلی
abulaalasubhani@gmail.com
+91-9891051676

برائے انتظامی امور وترسیل زر
عرفان احمد فلاحی جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
اعظم گڑھ (یوپی) 276121
+91-9453757380
hayatenau5@gmail.com

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلیٰ سید سبحانی	۵
اصلاح وتربیت کے عجب طریقے	مولانا نسیم احمد غازی فلاحی	۷
ہمارے زمانے کا جامعہ	مشرف حسین صدیقی فلاحی	۱۱
حضور اکرمؐ کی دعوتی حکمت عملی	طارق فارقلیط فلاحی مرحوم	۱۵
ادب اسلامی کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا کردار	ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن فلاحی	۲۳
	زبیر ملک فلاحی	۲۷
	محمد اظہر الدین فلاحی	۳۰
	ڈاکٹر ارشد جمال فلاحی	۳۱
	شاکر الاکرم فلاحی	۳۲
	محمد شریف فلاحی	۳۷
	اسامہ شعیب فلاحی	۳۸
	عبدالحمید حاکم (فلاحی)	۳۹
	زہیر احمد فلاحی	۴۲
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۵)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۴۵
عیدالاضحیٰ: مقصد اور پیغام	مروہ سبحانی فلاحی	۵۸
ایک سفر زنداں کا۔۔آوازوں کے جنگل میں	سعید اختر اعظمی	۶۱
شعر ونغمہ	نعیم احمد غازی فلاحی، سید راشد حامدی فلاحی، عزیز نبیل، محی الدین غازی، شاکر الاکرم شاکر، نعمان انور، ارشد جمال صارم، سالم سلیم	۶۴
جہان کتب	مبصرین	۶۸
آپ کے خطوط	قارئین	۷۲
جامعہ کے لیل ونہار	مصباح الباری فلاحی	۷۶
اخبار انجمن	ادارہ	۸۰
گوشۂ فارقلیط (بروفات طارق فارقلیط فلاحیؒ)	ادارہ	۸۳

اپنی بات

عظمت رفتہ کی بازیافت امت مسلمہ کے سامنے ہر سطح پر ایک زبردست چیلنج ہے۔ نئی نسل کے درمیان یہ مسئلہ یک گونہ اہمیت اور سنجیدہ توجہ کا حامل ہے۔ جب وہ دیگر اقوام کو دن بدن ترقی کرتے ہوئے اور تہذیب وتمدن کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، ساتھ ہی جب وہ اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں، اور اسلامی تاریخ کے تابناک ادوار سے گزرتے ہیں تو ان کے ذہن ودماغ میں بار بار یہ امنگ اٹھتی ہے کہ کاش وہ دور پھر آئے، جس کی تصویر اسلامی لٹریچر یا اسلامی تاریخ میں ملتی ہے، جب ذلت وپستی اور محکومی ومجبوری کے دلدل سے امت باہر آئے، اور تہذیب وتمدن اور فکر وثقافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر دوبارہ امامت کے منصب پر فائز ہوسکے۔

ایک طرف نئی نسل کی یہ امنگ ہے، وہیں دوسری جانب امت اسلامیہ کی موجودہ صورتحال ہے۔

ایک طرف مسلم اکثریتی ممالک ہیں، جہاں بنیادی انسانی حقوق تک کی پامالی ہے، آدمیت کا کوئی احترام نہیں، جمہوری اقدار اور سیاسی آزادی نام کی کوئی چیز نہیں، آزادی اور اظہار رائے کے اس دور میں بھی وہاں نئی نسل کے لیے حرکت وعمل کا کوئی موقع نہیں، نہ وہ اپنے ملک کی سیاست اور اپنے ملک کا مستقبل طے کرنے میں کوئی کردار ادا کرسکتے ہیں، اور نہ ہی اپنے ملک کی تعمیر وترقی میں ان کے لیے کسی طرح کا کوئی مثبت اور تعمیری رول ادا کرنے کی گنجائش ہے۔ چنانچہ یہاں نئی نسل کے درمیان دو قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں، ایک طرف تو وہ افراد ہیں جو حالات سے سمجھوتہ کئے ہوئے ہیں، جنھوں نے اپنی زندگی کو اپنی ذات تک محدود کررکھا ہے، حکومت جس رخ پر بھی جائے، انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ دوسری طرف کچھ نوجوان، خاص طور سے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں انتہائی بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت پائی جاتی ہے، اور وہ اپنی حکومتوں کے سلسلے میں شدید قسم کی بے اعتمادی کا شکار ہیں۔

دوسری طرف مسلم اقلیتی ممالک ہیں، جن میں سے بیشتر کے یہاں مسلم اقلیتوں کے حالات ناگفتہ بہ ہیں، مختلف ممالک میں فرزندان امت خطرناک ترین حالات سے دوچار ہیں، ایک طرف ان کی شناخت خطرے میں ہے، دوسری جانب ان کا مذہب اور عقیدہ نشانہ ستم بنایا جارہا ہے، لاکھوں اور کروڑوں کی آبادیاں ہیں، جنہیں بنیادی انسانی حقوق اور ہر طرح کی آزادی سے مختلف سطحوں پر محروم رکھا گیا ہے، بلکہ مختلف ممالک میں تو ان کے وجود کے لالے پڑے ہوئے ہیں، چنانچہ ان ممالک میں نئی نسل کو اپنا مستقبل انتہائی تاریک اور دھندلا نظر آتا ہے، اور وہ زبردست قسم کی فکری بے چینی اور اضطراب کا شکار ہیں۔ ان کو بظاہر دو ہی راستے نظر آتے ہیں، یا تو وہ ملک کے اکثریتی طبقے میں خود کو غائب کرلیں یا پھر سماج میں علیحدگی پسندی کا رویہ اختیار کرلیں، اور اس کے جس قدر خطرناک نتائج کا وہ آج سامنا کررہے ہیں، مستقبل میں اس سے بھی خطرناک نتائج کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرلیں۔

یہ موجودہ دنیا میں مسلم امت کی، معمولی استثناء کے ساتھ، مجموعی صورتحال ہے۔ دوسری طرف مسلم قیادت مختلف سطحوں پر زبردست بحران سے دوچار ہے۔ مسلم امت کی میدانی اور فکری قیادتوں کے درمیان گہری خلیج پائی جاتی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ امت کی میدانی قیادت کی جانب سے امت کی فکری قیادت کو صحیح معنوں میں قبول نہیں کیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سمت کے تعین اور طریق کار کی تحدید کے سلسلے میں مستقل خطرناک قسم کی غلطیاں سرزد ہوتی رہی ہیں۔ اس چیز نے نئی نسل کے اوپر مزید گہرے اثرات مرتب کئے، اور انہیں مزید ذہنی وفکری انتشار کا شکار بنادیا ہے۔

عظمت رفتہ کی بازیافت امت اسلامیہ کا ایک اہم اور سنجیدہ مسئلہ ہے، اسلام میں سیاسی اقتدار کے لیے جدوجہد کی کوئی بنیاد ہے یا نہیں، یہ ایک الگ مسئلہ ہے، لیکن دور اول سے اب تک کسی زمانے میں اسلامی اقتدار اور اسلام کے سیاسی غلبے کے لیے جدوجہد نہ کی گئی ہو، اس کا ثبوت ملنا مشکل ہے۔ اہل اسلام، صرف اہل اسلام ہی نہیں بلکہ ہر مذہب اور ازم کے ماننے والوں نے ہر دور میں اپنے اقتدار اور سیاسی غلبے کے لیے جدوجہد کا راستہ اختیار کیا ہے۔

اسلام میں تبدیلی کے بنیادی اصول کیا ہیں، اور کس قسم کی تبدیلی درکار ہے، اور اس تبدیلی کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا جائے گا، ان تمام ہی امور کے سلسلے میں قرآن وسنت کی تعلیمات میں بنیادی اشارات موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان سے موجودہ حالات کے تناظر میں رہنمائی حاصل کی جائے۔ موجودہ اسلامی لٹریچر ان امور کے سلسلے میں عام افراد امت کی راست رہنمائی کے لیے ناکافی معلوم ہوتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ امت کی فکری قیادت سامنے آئے اور مناسب انداز میں قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی کا فریضہ انجام دے۔ قرآن مجید کی آیات، بالخصوص آیات جہاد وقتال کے سلسلے میں امت کے درمیان آج بھی بڑا مغالطہ پایا جاتا ہے، اسلامی خلافت اور اسلامی حکومت کے سلسلے میں آج بھی کوئی واضح اور صاف تصور موجود نہیں ہے، جدید دور کے ترقی یافتہ، اقلیتی اور تکثیری معاشروں میں اسلام کی نمائندگی اور اسلامی تحریکات کے طریق کار کی بحث بھی بالکل ہی نئی بحث ہے، جس پر ابھی کافی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

گزشتہ دنوں نائیجیریا میں بوکوحرام کا مسئلہ سامنے آیا، عراق میں داعش کا ڈرامہ اور اس کی جانب سے عالمی خلافت کے قیام کا واقعہ کافی سرخیوں میں رہا، اور پھر حالیہ دنوں برصغیر میں القاعدہ کی شاخ کے قیام کے سلسلے میں ویڈیو بیان جاری کیا گیا۔ یہ اور اس جیسے جتنے بھی واقعات پیش آرہے ہیں، یہ امت اسلامیہ میں موجود فکری بحران کی غمازی کرتے ہیں، خواہ یہ سب کچھ بعض مسلم عناصر کی جانب سے کیا جارہا ہو، یا دوسروں کی جانب سے کیا جارہا ہو، اور اس کے لیے بعض سادہ لوح مسلم عناصر کو استعمال کیا جارہا ہو۔ بہرحال یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے، اسلامی کاز کے لیے جدوجہد کرنے والے افراد اور تحریکوں کو اس سلسلے میں سنجیدگی کا ثبوت دینا ہوگا، اور انتہائی تیز رفتار اقدامات کرنے ہوں گے، ورنہ مسلم امت میں در آنے والے یہ انتہا پسندانہ رجحانات نئی نسل اور نئے دور کے لیے ایک شدید مصیبت ثابت ہوں گے، ان کا سامنا کرنا آج جتنا ضروری ہے، کل اتنا ہی مشکل ہوگا۔

(ابوالاعلی سید سبحانی)

اصلاح وتربیت کے عجب طریقے

مولانا نسیم احمد غازی فلاحی، سکریٹری اسلامک ساہتیہ ٹرسٹ

بچوں کی اصلاح وتربیت آج ایک اہم اور سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یہ شکایت عام ہے کہ بچے بڑوں کی نصیحتیں قبول نہیں کرتے۔غور کرنے کی بات ہے کہ کہیں ہمارا رویہ اور طرز عمل ہی تو اس کا سبب نہیں ہے۔ذیل میں اصلاح وتربیت کے سلسلے میں کچھ مفید واقعات نقل کئے جارہے ہیں، ان سے اصلاح وتربیت کی کچھ عملی شکلیں ہمارے سامنے آئیں گی۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار ایک عورت اپنے بچے کو لے کر ایک بزرگ کے پاس گئی اور اُن سے عرض کیا کہ میرا یہ بچہ بہت زیادہ گڑ (میٹھا) کھاتا ہے جو اس کے لئے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔آپ براہ کرم اسے سمجھا دیں اور ایسا کرنے سے منع فرمادیں۔امید ہے کہ آپ کے کہنے اور نصیحت کرنے کا اس پر اثر پڑے گا اور یہ بہت زیادہ گڑ کھانے سے باز رہے گا۔

بزرگ نے اس عورت کی بات سن کر اس سے فرمایا کہ دو تین دنوں کے بعد آنا تب میں اس بچے سے بات کروں گا۔

وہ عورت دو تین دنوں کے بعد بچے کو لے کر ان بزرگ کے پاس پہنچی اور ان سے درخواست کی کہ بچے کو نصیحت فرمادیں۔ بزرگ نے بچے کو سمجھاتے ہوئے اس سے کہا کہ بیٹا بہت زیادہ گڑ نہیں کھانا چاہئے۔اس سے آپ کو نقصان ہوسکتا ہے۔

بچے کی ماں کو بزرگ کی اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی سی بات کے لئے انہوں نے دو تین دنوں کے بعد آنے کے لئے کہا جبکہ یہ بات تو وہ پہلے ہی دن کہہ سکتے تھے۔اس عورت نے اپنی الجھن کو بزرگ سے بیان بھی کر دیا اور ان سے اس کی وجہ دریافت کرنے لگی۔

بزرگ نے اس عورت کی الجھن دور کرتے ہوئے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میں خود بہت زیادہ گڑ کھاتا تھا۔اس لئے بچے کو اس بات سے کیسے منع کرتا جسے میں خود کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے دو تین دن کے بعد آنے کے لئے کہا اور میں نے اسی دن سے گڑ کھانا چھوڑ دیا۔اب جب تم بچے کو لے کر آئیں تو میں نے اس سے گڑ کھانے

کے لیے منع کیا۔

حکیم محمد ایوب صاحب (مرحوم) علاقے کی جانی مانی ہستی تھے۔ اللہ تعالی نے انہیں ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ وہ تحریک اسلامی کے فعال سپاہی تھے۔ ایک بار ان کے ایک دوست نے ان کو خبر دی کہ آپ کا فلاں بیٹا سگریٹ پینے لگا ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو بتادوں تاکہ آپ اس کی اصلاح کرسکیں۔

محترم حکیم صاحب یہ بات سن کر چند لمحے خاموش رہے اور پھر بغیر کچھ بولے وہاں سے اٹھ کر گھر کے اندر چلے گئے۔ ان کے دوست باہر ہی بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد حکیم صاحب باہر آئے اور اپنے دوست سے فرمایا کہ میں اپنے بچے کی اصلاح کیسے کرسکتا ہوں جبکہ میں خود اس بری لت میں مبتلا ہوں۔ ممکن ہے کہ مجھے سگریٹ پیتے دیکھ کر ہی اس نے بھی سگریٹ پینا شروع کر دیا ہو۔ بہر حال اب میری آنکھیں کھل گئیں اور میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب کبھی سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ میرے پاس سگریٹ کے کچھ پیکٹ گھر میں رکھے تھے، میں ان سب کو کوڑے دان میں پھینک کر آیا ہوں۔ حکیم صاحب کے اس رویے کا اثر یہ ہوا کہ ان کے بیٹے نے بھی سگریٹ سے توبہ کر لی۔

میں ایک صاحب کے گھر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی ایک بچی جس کی عمر ۷۔۸ سال رہی ہوگی اپنے ابو کے سامنے مچلنے لگی کہ مجھے نیا فراک لینا ہے۔ اس کے ابو نے اسے سمجھایا کہ تمہارے پاس کئی فراک ہیں، اس لئے مزید فراک کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر وہ بچی اصرار کئے جارہی تھی کہ مجھے نیا فراک چاہئے۔ بچی کی ضد کو دیکھتے ہوئے اس کے والد اسے نیا فراک دلانے پر آمادہ ہوگئے۔ تبھی کسی نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ انہوں نے بچی کو دروازے پر بھیجا۔ بچی نے واپس آکر بتایا کہ بریلی والے ملاجی آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ سردی بہت ہے، ہمارے پاس اوڑھنے کے لئے لحاف نہیں ہے۔ بچے رات بھر سردی میں ٹھٹھرتے رہتے ہیں، ہمیں ایک لحاف دلا دیجئے۔

صاحب خانہ نے بچی سے کہا کہ بیٹی! بتاؤ تمہیں فراک دلاوں یا انہیں لحاف؟ بچی نے فوراً جواب دیا کہ ابو! آپ ملاجی کو لحاف دلا دیجئے۔ سردی بہت ہے اور ان کے پاس لحاف نہیں ہے۔ میرے پاس تو کئی فراک ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بچی کے ذریعے ہی لحاف کی رقم باہر بھجوادی۔ ملاجی دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

مولانا اختر احسن اصلاحی (مرحوم) مدرسۃ الاصلاح کے صدر تھے۔ مولانا جماعت اسلامی کی مجلس شوری کے رکن تھے۔ دیکھنے میں نہایت سادہ اور دبلے پتلے مگر علم وعمل کے سمندر تھے۔

مدرسے میں شام کے وقت ایک لڑکا داخلے کے لیے آیا۔ اسے مہمان خانہ میں ٹھہرا دیا گیا۔ وہ لڑکا بہت شرارتی تھا اور اس کے گھر والوں نے اسے اس غرض سے مدرسہ بھیجا تھا کہ شاید وہاں اس کی اصلاح ہو جائے۔ وہ لڑکا ہاتھ میں لوٹا لئے باتھ روم جانے کے لئے باہر آیا۔ باہر ہینڈ پمپ کے پاس مولانا مرحوم نظر آئے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ صاحب یہاں کے صدر ہیں۔ اس نے نہایت بدتمیزی کے ساتھ مولانا سے دریافت کیا کہ باتھ روم

کہاں ہے؟ مولانا نے باتھ روم کی طرف اشارہ کر کے اس کی رہنمائی کی۔اب مولانا ہینڈ پمپ تک پہنچ چکے تھے اور ہینڈ پمپ چلا کر اپنا لوٹا بھرنے لگے کہ اس لڑکے نے جلدی سے لپک کر مولانا کے لوٹے کو ڈھکیلتے ہوئے اپنا لوٹا ہینڈ پمپ کے منہ پر لگا دیا۔مولانا اپنا لوٹا الگ کر کے اس لڑکے کا لوٹا بھرنے کے لئے ہینڈ پمپ چلانے لگے۔ مولانا آہستہ آہستہ ہینڈ پمپ چلا رہے تھے تو اس لڑکے نے مولانا سے کہا، بڑے میاں! ذرا زور سے چلاؤ کیا کھانا نہیں کھاتے۔مولانا سمجھ گئے کہ یہ لڑکا آج ہی آیا ہے۔مولانا نے مسکراتے ہوئے پمپ کو تیزی کے ساتھ چلایا اور اس لڑکے کا لوٹا بھر دیا۔لڑکا پھر شرارت بھرے انداز میں بولا اب ہوئی نہ بات۔

دوسرے دن صبح کو اس لڑکے کے داخلے کی کارروائی ہونی تھی۔اس کو بتایا گیا کہ تمہیں ٹسٹ کے لئے صدر صاحب کے کمرے میں جانا ہے۔وہ لڑکا کمرے میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ یہاں تو وہی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں جن کے ساتھ رات اس نے بدتمیزی اور گستاخی کی تھی۔وہ بڑا شرمندہ ہوا اور فوراً کمرے سے باہر آ گیا۔اس کا خیال تھا کہ اب اس کا داخلہ تو ہونے سے رہا۔

مولانا نے اس لڑکے کو دیکھ لیا اور اندر بلایا۔بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھایا۔اس کی خیریت دریافت کی۔ گھریلو حالات معلوم کئے۔پھر اسے مٹھائی کھانے کو دی۔یہ سب مولانا نے اس لئے کیا تاکہ رات کے واقعے سے اس کے اندر جو جھجک اور احساس جرم پیدا ہوا ہے وہ ختم ہو جائے اور وہ یہ سمجھ لے کہ میں اس واقعے کی وجہ سے کسی طرح کا انتقام یا کسی طرح کی کاروائی کرنے والا نہیں ہوں۔بہرحال کچھ باتیں پوچھ کر مولانا نے اس کا داخلہ منظور کر لیا۔

اس شرارتی لڑکے پر مولانا کے اس اخلاق اور ان کی اس اعلیٰ ظرفی کا بہت اثر پڑا اور وہ مولانا سے اپنی حرکت پر معافی طلب کرنے لگا۔اس نے مولانا کو یقین دلایا کہ آئندہ اس کی جانب سے انہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔وہ یہاں پوری محنت اور یکسوئی کے ساتھ پڑھے گا۔مولانا کے حسن اخلاق اور کشادہ دلی نے پہلے ہی دن اس لڑکے کی اصلاح کر دی۔پھر اس نے دل لگا کر تعلیم حاصل کی اور کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔

یہ واقعہ ہمارے استاد مولانا شہباز اصلاحی (مرحوم) نے سنایا تھا۔انہوں نے یہ واقعہ بھی سنایا:

ایک اقامتی مدرسہ میں طلبہ کے نگراں کا معمول تھا کہ وہ فجر کی اذان کے بعد چھڑی لے کر بورڈنگ (دارالاقامہ) کی طرف جاتے اور ایک ترتیب سے کمروں میں سوتے ہوئے طلبہ کو جگاتے اور پھر نماز فجر کے لئے مسجد چلے جاتے۔نماز فجر کے بعد وہ فوراً بورڈنگ کا رخ کرتے اور دیکھتے کہ کون طالب علم ابھی تک سویا ہوا ہے۔طلبہ عام طور پر اٹھ جاتے اور نماز فجر میں شریک ہوتے۔ایک روز انہوں نے دیکھا کہ ان کے جگانے کے باوجود ایک طالب علم چادر اوڑھ کر سویا ہوا ہے۔انہوں نے اس لڑکے کے دو تین چھڑیاں رسید کر دیں۔اس طالب علم نے بہانا بناتے ہوئے نگراں سے کہا کہ مولانا، مجھے بخار ہے۔اس کی یہ بات سنتے ہی نگراں صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں نے بغیر سبب معلوم کئے محض بدگمانی کی وجہ سے اس کی پٹائی کر دی۔انہوں نے

چھڑی ایک طرف پھینکی اور اس لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس سے معافی مانگنے لگے۔ وہ طالب علم اس صورت حال سے پریشان ہوگیا اور فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور مولانا صاحب کے معافی طلب کرنے پر شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ مولانا صاحب معافی پر اصرار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ جب تک تم مجھے معاف نہیں کروگے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ لڑکے کو مجبوراً معافی کے الفاظ زبان سے ادا کرنے پڑے۔ تب انہوں نے اس لڑکے سے دوا وغیرہ کے سلسلے میں دریافت کیا اور وہاں سے چلے گئے۔ مولانا کے اس کردار کا اس طالب علم پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ اس واقعہ کے بعد اس کے اندر نمایاں خوشگوار تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔

مولانا شبیر احمد اصلاحی (مرحوم) جامعۃ الفلاح میں تعلیم و تربیت کی خدمت دل و جان سے انجام دیتے تھے۔ وہ جامعہ کے صدر بھی رہے۔ طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لئے بہت فکر مند رہتے اور اس کے لئے ہمیشہ تدابیر سوچا کرتے۔ ایک بار انہوں نے ہماری کلاس کے سبھی طلبہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور مٹھائی سے ان کی تواضع کی۔ سبھی طلبہ فرش پر حلقہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک بڑی سی پلیٹ میں مٹھائی رکھ دی گئی۔ مولانا مرحوم نے طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگ مٹھائی کھائیں لیکن آپ میں سے ہر شخص کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ میرے ساتھی کو اس کا زیادہ موقع ملے۔ مطلب یہ کہ ہر شخص یہ کوشش کرے کہ میرا ساتھی زیادہ کھائے اور میں کم۔ عام طور سے لوگ ایسے مواقع پر دوسروں کو ترجیح دینے کے بجائے خود زیادہ سے زیادہ اور سب سے پہلے مستفید ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا نے اس عادت کو ترک کرنے کے لئے اس عملی تربیت کا نظم کیا۔ مولانا مرحوم اکثر اسی طرح طلبہ کی تربیت فرماتے تھے۔

مولانا کی نصیحت کا وہاں موجود طلبہ پر یہ اثر ہوا کہ کوئی بھی طالب علم مٹھائی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہا تھا بلکہ چاہتا تھا کہ دوسرے لوگ پہلے ہاتھ بڑھائیں۔ بہر حال طلبہ نے مٹھائی کھائی اور ساتھ ہی اس نصیحت کو بھی دل و دماغ میں بٹھالیا۔ اس واقعے کو چالیس پینتالیس سال ہو چکے ہیں مگر مولانا مرحوم کی نصیحت آج بھی دل و دماغ میں تازہ ہے کہ کسی تقریب یا دعوت کے موقع پر دسترخوان پر بے صبروں کی طرح ٹوٹ نہیں پڑنا چاہئے، بلکہ سلیقے اور ایثار کا مظاہرہ ہونا چاہئے۔

مولانا کی یہ نصیحت اس وقت اور بھی زیادہ یاد آتی ہے جب یہ منظر دیکھنے کو ملتا ہے کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور دیندار لوگ کسی تقریب کے موقع پر کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں اور اپنی پلیٹوں میں اس قدر کھانا ایک ہی بار میں نکال لیتے ہیں گویا یہ ان کا پہلا اور آخری موقع ہے۔

ہمارے زمانے کا جامعہ

مشرف حسین صدیقی فلاحی، نئی دہلی

*(گزشتہ شماروں میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے فلاحی بھائیوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کی کچھ یادیں اور تأثرات ہمارے ساتھ شیئر کیے تھے، اس ماہ ۱۹۷۰ء میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے ایک برادر بزرگ کی تحریر پیش خدمت ہے۔ ان شاء اللہ اس کالم سے ہمارے لیے ابتدائی دور کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے، ابتدائی لوگوں کے خوابوں اور تمناؤں سے آشنا ہونے، اس کی روشنی میں حال کا جائزہ لینے اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے میں آسانی ہوگی۔ **مدیر**)*

تعلیم کے لیے جامعۃ الفلاح کا انتخاب والدین نے کیا تھا، اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اس وقت مولانا جلیل احسن ندوی صاحب مرحوم جن سے ہمارے والدین کے کافی گہرے تعلقات تھے جامعۃ الفلاح میں تھے، چنانچہ اُن ہی کی وجہ سے میرا جامعہ میں داخلہ کرایا گیا۔

جامعہ میں میرا قیام چار سال ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک رہا۔ عربی سوم میں میرا داخلہ ہوا تھا۔ عربی سوم میں داخلہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ میں رامپور کی درسگاہ اسلامی سے پڑھ کر آیا تھا۔ رامپور کی درسگاہ میں عربی وغیرہ کی اسپیشل کلاسیز چلتی تھیں، وہاں میں نے دسویں تک پڑھائی کرلی تھی، اس میں عربی کی تعلیم بھی اچھی خاصی ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے عربی سوم میں میرا داخلہ ہوگیا۔ درسگاہ سے فراغت کے بعد جامعہ آنے سے قبل چھ ماہ ندوۃ العلماء میں بھی رہنے کا موقع ملا۔

جامعہ میرے لیے بالکل ہی ایک نئی چیز تھی، جامعہ تک پہنچنا خود میرے لیے ایک دلچسپ واقعہ تھا، یکہ میں بیٹھ کر اعظم گڑھ سے بلریا گنج کا سفر طے کیا۔ یہ میرے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی۔ اور پھر جامعہ میں قیام رہا، وہاں بالکل دیہات والا ماحول تھا، شہر سے بالکل مختلف ماحول، جبکہ ہم رامپور جیسے شہر سے وہاں گئے تھے، لیکن بہر حال وہاں رہنے اور پڑھنے میں اچھا لگا۔ خاص طور سے وہاں اساتذہ سے ہم طلبہ کا جو تعلق تھا، اس کی وجہ سے وہاں خوب دل لگا۔ مولانا جلیل احسن ندویؒ، اور مولانا ابوالمکارم صاحب وغیرہ بہت خیال رکھتے تھے۔ بہت شفقت کا

رویہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ اختیار کیا۔

اس وقت طلبہ اور اساتذہ کتنے تھے، اس کی صحیح تعداد تو نہیں یاد ہے، البتہ اتنا یاد ہے کہ ہمارے کلاس میں سب سے زیادہ طلبہ تھے، ہم سے پہلے کے کلاسیز میں اتنے طلبہ نہیں تھے، جتنے کہ ہمارے کلاس میں تھے۔ اور اُس وقت تک ہماری ہی کلاس کے ساتھی سب سے بڑی تعداد میں فارغ ہوئے تھے۔

اس وقت عمارتوں میں سید مودودی منزل کا گراؤنڈ فلور تھا، جس میں ایک ہال اور چند کمرے تھے، ہال میں نماز ادا کی جاتی تھی، اور اسی میں ہماری کلاس بھی چلتی تھی۔ ہال سے متصل کمروں میں مولانا ابوبکر اصلاحی اور مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی رہائش تھی۔ اس کے علاوہ کچھ کمرے تھے، جن میں طلبہ کی رہائش تھی۔ مطبخ کی عمارت بھی تھی۔

مطبخ میں کھانے کا اجتماعی نظم تھا، اس وقت ٹفن سسٹم نہیں تھا، سب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، جس میں کھلانے والوں کی باری لگا کرتی تھی۔ کبھی ہمیں کھانے کی کوئی شکایت نہیں رہی، جو چیز دستیاب رہتی تھی، وہی بنتی تھی۔ مطبخ کے انچارج جناب جنید صاحب تھے، اور وہ بہت ہی شفقت کے ساتھ سب کے ساتھ پیش آتے تھے، اللہ ان کی مغفرت کرے۔

جامعہ کا کوئی گیٹ وغیرہ نہیں تھا، چہار دیواری بھی نہیں تھی، ہر طرف سے کھلا ہوا تھا، مولانا شہباز صاحب کی نگرانی تھی، ان کی اجازت کے بعد ہی ہم باہر جاتے تھے۔ وہ ہمارا بے حد خیال رکھتے تھے، نمازوں کے لیے جگاتے، ہر بات کا خیال رکھتے، اور ہماری کوئی ضرورت ہو، یا ہمیں کوئی پریشانی ہو، اس کا فوراً انتظام کرتے تھے۔

اس وقت اساتذہ اور طلبہ کا رشتہ بہت ہی مبارک تھا، بہت اچھا رشتہ تھا، بہت پیارا رشتہ تھا، آج تک اس کی یادیں تازہ ہیں۔ خاص طور سے اساتذہ کی طلبہ کے ساتھ جو شفقت و محبت تھی، مولانا شہباز صاحب، مولانا عبدالحسیب صاحب، مولانا جلیل احسن ندوی صاحب، مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحب، اور مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی ہمارے اہم اساتذہ میں سے تھے۔ اسی طرح ماسٹر افضال صاحب تھے، وہ ہمیشہ مجھے یاد رہیں گے، وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح رکھتے تھے۔ مولانا عنایت اللہ اسد سبحانی ہمیں مشکوۃ شریف پڑھاتے تھے، ان کے درس میں تذکیری اور تربیتی پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ ان کی شفقت و محبت اور اُن کی درس و تدریس کا انداز آج بھی مجھے یاد ہے۔ ان سے ہمارے گہرے روابط تھے۔ ان تمام ہی اساتذہ کا بڑا گہرا اثر رہا ہماری شخصیت پر۔ میں ان تمام سے بے حد متأثر ہوا ہوں، اور ان تمام کی بے حد شفقت و محبت مجھے حاصل رہی ہے۔

اساتذہ کے درمیان بھی بہت ہی محبت پائی جاتی تھی، ہر کوئی دوسرے کا خیال رکھتا تھا، بہت ہی کشادگی اور وابستگی تھی ان کے درمیان، ان کے درمیان کسی قسم کی کوئی سیاست نہیں تھی، سنا ہے کہ اب ایسا نہیں ہے، اب اساتذہ کے درمیان وہ تعلق نہیں رہا۔

تربیتی ماحول اتنا اچھا تھا کہ اس زمانے کی نمازیں آج تک یاد آتی ہیں۔ اس زمانے میں نماز پڑھنے میں جو مزہ آتا تھا، اب نہیں آتا۔ اس زمانے میں جو ماحول تھا وہاں پر، جو تربیت کا انداز تھا، اور مولانا شہباز صاحب وغیرہ کی جو تقریریں ہوتی تھیں، ان کا جواب نہیں۔ اس زمانے میں تو ہر چیز میں مزہ آتا تھا۔ تنہائی میں نماز پڑھنے میں بھی مزہ آتا تھا، اور مسجد میں نماز پڑھنے میں بھی مزہ آتا تھا، وہ بہت ہی شاندار دور تھا۔

تعلیمی ماحول بھی بہت اچھا تھا، میں تو اپنے کلاس میں ہمیشہ فرسٹ پوزیشن حاصل کرتا رہا۔

آخری سال میں جب ہمارے کلاس والے جمعیۃ الطلبہ کے ذمہ دار ہوئے، اس وقت ہم نے منصوبہ بنایا تھا کہ جامعہ میں لائبریری ہو، اس کے لیے الماریوں کا انتظام کرنا، اس کے لیے کتابیں اکٹھا کرنا، اور لوگوں سے تعاون لینا، یہ تمام کام ہم نے جمعیۃ کی ذمہ داری ملنے کے بعد کیے۔

جامعہ میں اس وقت مسجد کی تعمیر کا آغاز ہوا تھا، ہم لوگوں نے اس کے لیے خوب اینٹیں اٹھائی تھیں، اس میں ہم تمام ساتھیوں نے خوب محنت کی تھی۔ اس وقت ذمہ داران میں مولانا شہباز صاحب، مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب اور ڈاکٹر خلیل احمد صاحب تھے، یہ تمام ہی جامعہ کے اہم اور مخلص ذمہ داران تھے، جن کا حوصلہ اور جذبہ دیکھنے لائق تھا۔

حکیم ایوب صاحب باقاعدہ جامعہ کے ذمہ دار نہیں تھے، لیکن ان کی وہاں کلینک تھی، ہم لوگوں سے ان کے بہت ہی اچھے تعلقات تھے، وہ جامعہ کے طلبہ اور متعلقین کا بہت ہی خیال رکھتے تھے۔

بلریا گنج کے لوگوں میں حکیم ایوب صاحب اور منشی انور صاحب سے میرے بہت ہی گہرے تعلقات تھے، ان کے اندر جامعہ کے تعلق سے جو جذبہ پایا جاتا تھا، وہ مثالی تھا۔ جامعہ کے طلبہ ہی نہیں، بلکہ ان طلبہ کے اہل خانہ کے ساتھ بھی ان کا بہت اچھا رویہ رہتا تھا۔ حکیم ایوب صاحب پورے جامعہ کو دوائیں مفت دیتے تھے، اگر کسی طالب علم کے گھر والے یا متعلقین آتے اور ان کو دوا لینی ہوتی تو ان سے بھی کوئی فیس نہیں لیتے تھے، یہ بہت بڑی چیز ہے، جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا، خاص طور پر اس کمرشیل دنیا میں اس قسم کے لوگ نہیں ملتے ہیں۔

اس وقت جامعہ بالکل ابتدائی شکل میں تھا، اس وقت جامعہ کے مستقبل کے بارے میں ہمارے ذہن میں کوئی خیال کم ہی پیدا ہوتا تھا، البتہ اپنے مستقبل کی فکر ضرور رہتی تھی۔ اس سلسلے کی ایک بات مجھے آج تک یاد ہے، اور شاید زندگی بھر نہ بھولوں، وہ مولانا شہباز صاحب کی نصیحت تھی کہ ''حلال کمانا، اور حرام کی طرف مت بڑھنا، کوئی تمہارا ساتھی اگر کسی بہت اچھے اور اونچے مقام تک پہنچ جائے تو یہ مت سوچنا کہ تم کمزور ہو، تم نے دینی تعلیم حاصل کی ہے اس لیے ایسا ہے۔ اپنے علم کو اور جو تعلیم تم نے حاصل کی ہے، اس کو کبھی چھوٹا نہ سمجھنا، رازق اللہ تعالی ہے، وہ جس کو جتنا چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے دیتا ہے۔'' یہ بات مجھے آج تک یاد ہے، اور اس پر میں عمل بھی کرتا ہوں۔

آخر میں ذکر کرنا چاہوں گا مادر علمی کے سلسلے میں دو چیزوں کا، جو میری نظر میں اس کو دوسرے اداروں

سے ممتاز کرتی ہیں:

(۱) جماعت اسلامی سے وابستگی کے نتیجے میں جامعہ کا مزاج اور اس کی فکر، دونوں چیزیں بالکل ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ عام مدارس میں صرف ایسا لگتا کہ جیسے مسجدوں کے امام بنا رہے ہیں، اور مکاتب کے لیے معلم تیار کر رہے ہیں، لیکن جامعہ کے طلبہ زندگی کے میدان میں دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں، اور ہر شعبے میں آگے بڑھنے والے ہیں۔ یہ کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والے طلبہ سے کسی بھی طرح سے پیچھے نہیں ہوتے۔

(۲) اسی طرح جامعہ کے طلبہ میں کبھی احساس کمتری نہیں پیدا ہوتا، حالانکہ عام طور سے مدارس میں خطرناک حد تک یہ احساس کمتری پایا جاتا ہے۔ یہ بہت بہت بڑا فرق ہے جو میں نے جامعہ اور دیگر مدارس کے درمیان محسوس کیا ہے۔

جامعہ سے فراغت کے بعد میں ادارہ تحقیق وتصنیف علی گڑھ چلا گیا، وہاں مولانا صدرالدین اصلاحی مرحوم اور مولانا سید جلال الدین عمری صاحب تھے، لیکن بڑا ہی خشک ماحول تھا وہاں کا۔ بڑی مشکل سے میں نے دو ماہ وہاں گزارے اور پھر وہاں سے واپس آ گیا۔ واپس رامپور آیا تو وہاں والد صاحب نے ماچس کا کام شروع کیا تھا، وہ دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ایک کپڑے کی دوکان کی انہوں نے میرے لیے، میں نے کافی دنوں تک اس کو بھی سنبھالا۔ اس کے بعد ایک چائے کا ہوٹل کھولا، میں اس وقت پچیس پیسے کی چائے بیچا کرتا تھا، اور شام تک تقریبا دو سو سے تین سو روپے تک کی چائے فروخت ہو جایا کرتی تھی۔

اس دوران اور آج بھی ہمیشہ مجھے مولانا شہباز صاحب کی نصیحت یاد رہی، کبھی میں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ میں کوئی چھوٹا کام کر رہا ہوں۔ ماچس، چائے اور کپڑے کا کاروبار کیا، ہمیشہ مولانا شہباز صاحب کی نصیحت یاد رہی ''حلال کمانا، اور حرام کی طرف مت بڑھنا، کوئی تمہارا ساتھی اگر کسی بہت اچھے اور اونچے مقام تک پہنچ جائے تو یہ مت سوچنا کہ تم کمزور ہو، تم نے دینی تعلیم حاصل کی ہے اس لیے ایسا ہے۔ اپنے علم کو اور جو تعلیم تم نے حاصل کی ہے، اس کو کبھی چھوٹا نہ سمجھنا، رازق اللہ تعالی ہے، وہ جس کو جتنا چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے دیتا ہے۔''

اسی دوران جب کہ میں رامپور میں مختلف قسم کے کاموں میں یکے بعد دیگرے مصروف رہا، ایک دفعہ مجھے اپنے بڑے بھائی کے دوست سے ملنے دہلی آنا ہوا۔ یہ ہندوستان میں لیبیا کے سفیر تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مین پاور کا کام کیوں نہیں شروع کرتے، یہ کام کا اچھا میدان ہے۔ ان کے کہنے پر میں نے مین پاور کا کام شروع کیا، جو آج تک جاری ہے، والحمدلله علی کل حال

البتہ جامعہ سے فضیلت کے بعد اپنا تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ میرے پاس جو کچھ تعلیمی ڈگری ہے وہ بس جامعۃ الفلاح کی ہے۔

حضور اکرمؐ کی دعوتی حکمت عملی

طارق فارقلیط فلاحی مرحوم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔ پہلے ہی روز حضرت خدیجہؓ ایمان لے آئیں، حضرت علیؓ ایمان لائے، حضرت زیدؓ ایمان لائے اور حضرت ابوبکرؓ ایمان لائے۔ یہ وہ لوگ تھے جو حضورؐ کے نہایت قریبی تھے اور اندر اور باہر ہر چیز سے واقف تھے۔ جنہوں نے ہر زاویہ سے حضورؐ کو دیکھا تھا۔ حضورؐ ایک تابناک کردار کے مالک تھے جو آسمانِ مکہ پر چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ نبوت سے پہلے بھی آپ صادق اور امین کے لقب سے جانے جاتے تھے۔

دعوت وتبلیغ میں ہر ایک نے اپنا کردار ادا کیا، مگر حضرت خدیجہؓ کا کردار بہت نمایاں ہے، وہ صرف آپؐ کی رفیقہ حیات ہی نہ تھیں بلکہ خاندانی پس منظر، صاف ستھرا کردار اور معاشی مضبوطی کی وجہ سے سپر اور ڈھال تھیں، حضورؐ کے لئے انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اسی لئے سیرت نویس ان کو وزیر کا مقام دیتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ ایک موثر شخصیت، صاف ستھرا کردار اور وسیع حلقۂ اثر کے مالک تھے۔ ماحول میں نفوذ حاصل کرنے اور اسے متاثر کرنے کی صلاحیت تھی، چنانچہ نوجوانوں کا ایک اچھا خاصا حلقہ توحید کے دامن میں آ گیا۔ حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، اور حضرت زبیر بن العوامؓ وغیرہ ایمان لائے۔ پھر حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ، حضرت ابوسلمہؓ، عبدالاسد بن ہلالؓ، حضرت عمیرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت جعفر بن ابوطالبؓ ایمان لائے اور حضورؐ کے گرد ایک چھوٹی سی جماعت اکٹھا ہوگئی۔

حضورؐ نے دعوت کا آغاز خاموش طریقے سے کیا، کیونکہ یہ کام بہت ہی مشکل تھا اور اس وقت کا معاشرہ اس کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ قبائلی عصبیت اپنے شباب پر تھی، ظلم وستم اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ امن اور شانتی نام کی کوئی چیز نہیں تھی، معاشرہ دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ کچھ لوگوں کو زندگی کے تمام حقوق حاصل تھے اور وہ خدا بنے بیٹھے تھے اور کچھ انسان جانوروں سے بھی بدتر پوزیشن میں تھے، ان کو کسی طرح کا کوئی حق حاصل نہیں تھا، وہ بیچے اور خریدے جاتے تھے اور جانوروں کی طرح ان کی باقاعدہ بازار لگتی تھی، عدل وانصاف اور مساوات کا تصور محال تھا، خواتین کا کوئی مقام نہیں تھا، لڑکیاں مار ڈالی جاتیں یا زندہ دفن کر دی جاتی تھیں، جوا، شراب، زنا عام

تھا، پورا معاشرہ شرک میں ڈوبا ہوا تھا، ہر خاندان کا ایک الگ بت تھا جس کی پوجا کی جاتی تھی، یہاں تک کہ خدا کا مقدس گھر خانہ کعبہ بتوں سے بھرا ہوا تھا، ۳۶۰ / بت اس میں رکھے ہوئے تھے۔

حضورؐ نے توحید کے بنیادی نکتہ سے دعوت کا آغاز کیا، آپ نے فرمایا "یَاقَوْمِ اعْبُدُوْاللہَ مَالَکُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَیْرُہ "۔اے برادران قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں (اِنِّی رَسُوْلُ اللہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَاِلَی النَّاسِ عَامَّۃً) مجھ پر ایمان لاؤ، میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

حضورؐ نے فرمایا! ایک دن قیامت آنے والی ہے، سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، دنیا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ اس کی جگہ ایک اور دنیا بنائے گا۔ جہاں سارے اگلے پچھلے لوگ اٹھائے جائیں گے، ان کا حساب ہوگا اور ہر ایک کو اپنے کئے کا پھل ملے گا۔ آپ نے فرمایا اس دن سے آگاہ رہو:

"یوم لَاتَمْلِکُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَیْئاً وَالْاَمْرُیَوْمَئِذٍ لِلہِ"، "یَوْمَ لَاتَذِرُ وَاذِرَۃٌوِزْرَاُخْرَیٰ"، "فَمَنْ یَّعْمَلُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍخَیْراً یَرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلُ مَثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَرَہٗ"۔

جب فَاصْدَعْ بِمَا تُؤمَرُ کا حکم آیا تو نبی کریمؐ کوہ صفا پر کھڑے ہو گئے اور واصباحاہ! واصباحاہ! کی آواز لگانے لگے، مکہ کے ہر قبیلہ کا نام لے لے کر پکارا، آپ پہاڑ کے دونوں جانب دیکھ رہے تھے۔ آپ نے پہاڑ کا انتخاب نبوی حیثیت کے مطابق کیا تھا، کیونکہ نبی دنیا اور آخرت دونوں کو دیکھتا ہے۔ انسان جو خیر وشر پر عمل کی آزادی لئے اس دنیا میں آیا ہے، وہ آخرت سے غافل ہو جاتا ہے، حالانکہ اس کے لئے سب سے بڑا خطرہ آخرت میں ہے اور وہ جہنم کی آگ ہے۔ جب سارے لوگ اکٹھا ہو گئے تو آپ نے فرمایا: اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ صبح کو یا شام کو تم پر دشمن حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم لوگ میری بات مانو گے، لوگوں نے جواب دیا کیوں نہیں! آپ صادق اور امین ہیں، ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "اللہ کا عذاب نزدیک ہے، اس پر ایمان لاؤ تاکہ آخرت کے عذاب سے بچ جاؤ"۔ اس طرح آپؐ نے عام اعلان کر دیا اور جو دعوت تین سال تک خاموشی سے دی جارہی تھی اس کا اعلان عام ہو گیا۔

پھر جب یہ حکم آیا کہ قریبی رشتے داروں کو ڈراؤ تو آپ نے بالکل قریب کا انداز اختیار کیا۔ آپؐ نے حضرت علی کو حکم دیا کہ ایک ضیافت کا انتظام کرو، آپ نے رشتہ داروں کو مدعو کیا، اور جب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو آپ نے بات رکھنی چاہی، مگر ابولہب نے موقع نہ دیا اور لوگ منتشر ہو گئے ، آپؐ نے دوسرے دن پھر مدعو کیا اور کھانے کے بعد اسلام کا پیغام پہنچایا۔ آپؐ نے فرمایا میں تمہارے لئے وہ بات لے کر آیا ہوں جس سے اچھی بات کوئی شخص اپنے قبیلے کی طرف نہیں لایا۔ بتاؤ اس کام میں کون میرا مددگار رہوگا، لوگ خاموش رہے مگر ایک کمزور دبلا، پتلا لڑکا جس کی آنکھیں دکھ رہی تھیں، خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے کہا میں آپ کا ساتھ دوں گا اور اس نے آخر وقت تک آپؐ کا ساتھ دیا، وہ حضرت علیؓ تھے۔

اس کے بعد دعوت کی علانیہ تبلیغ شروع ہوگئی۔ آپ نے دعوت کا جو انداز اختیار کیا، وہ بالمشافہ ملاقاتیں اور روبرو گفتگو تھی۔ آپ ہر قبیلے اور سردار کے پاس گئے اور توحید، رسالت، آخرت کی صاف اور واضح بات مثبت انداز میں بھی رکھی اور بتوں کی بیچارگی بھی واضح کی۔

آپؐ کے سماجی تعلقات اور تجربات بہت وسیع تھے اور آپؐ ہر ایک کی نفسیات سے واقف تھے۔ کس کے اندر خیر، اخلاقیات اور صالحیت کا کتنا عنصر ہے آپ کو معلوم تھا اور آپ اسی ترتیب سے ملاقات اور پیغام رسانی کا کام کرتے تھے۔

آپؐ نے بچپن میں بکریاں چرائیں اور بعض دفعہ اجرت پر دوسروں کی بکریاں بھی چرائیں۔ اس سے آپؐ ان لوگوں سے روبرو ہوئے جو بکریاں چرانے والے تھے۔ پھر آپ نے تجارت کی اور تاجروں کی نفسیات اور کاروبار سے واقفیت حاصل کی۔ آپ اس خاندان کے فرد تھے جس کی سیادت اور قیادت مسلم تھی۔ سرداران اور رؤساء کی نفسیات کو آپ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ اس لئے آپ کو دعوت پہنچانے میں کوئی جھجک پیش نہیں آئی، البتہ اس کے ردعمل کے طور پر مخالفت میں شدت آتی گئی اور آپؐ جس قدر کامیاب ہوتے گئے اور اسلامی قافلہ جس قدر بڑھتا گیا لوگوں کا ظلم وستم اور مخالفت بھی بڑھتی گئی۔

سماجی اعتبار سے غلام سب سے مظلوم تھے اور ان کی دادرسی کے لئے نہ کوئی عدالت تھی اور نہ کوئی فورم اور نہ ہی ان کا کوئی حق تھا۔ اسلام کمزوروں کی حمایت میں کھڑا نظر آیا اور آپؐ کمزوروں اور مظلوموں کے ساتھ ہر جگہ کھڑے نظر آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے کمزور طبقات جو ظلم وجور کی چکی میں پس رہے تھے، وہ آگے بڑھے۔

آپؐ نے عدل وانصاف اور مساوات کی اسلامی تعلیمات کو نمایاں انداز میں پیش کیا، سماج میں رائج برائیوں پر کھل کر تنقید کی اور اس سے بچنے کی واضح انداز میں تلقین کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام آگے بڑھتا گیا اور ایک منزل پر پہنچ گیا جہاں مشرکین کو محسوس ہوا کہ اسلام کو روک پانا مشکل ہے، لہٰذا انہوں نے ایمان لانے والوں پر مزید ظلم وستم شروع کردیئے۔

سیرت کے مطالعہ اور غور وفکر سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ آپؐ کو اول روز سے اسلام کے غلبہ اور پوری دنیا پر چھا جانے کا بہت پختہ یقین تھا اور کبھی کسی زاویہ سے بھی آپؐ نے کمزور اشارے نہیں دیئے۔ آپؐ نے دعوت کو آگے بڑھانے کے لئے ہمیشہ اقدامی پوزیشن اختیار کی اور کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، یہی وجہ ہے کہ جب تک مشرکین مکہ نے خانہ کعبہ کے دروازے آپؐ پر بزور بند نہیں کردیئے، آپؐ نے خانہ کعبہ کو مرکز بنایا، اس لئے کہ باہر سے آنے والا ہر شخص خانہ کعبہ سے گزرتا تھا اور آپ اس سے گفتگو کا موقع نکال لیتے تھے۔ دعوتی ملاقاتوں سے جو وقت بھی بچتا تھا آپ خانہ کعبہ میں گزارتے تھے۔ مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شروع میں حضورؐ کو ہجرت کے اشارے نہیں ملے تھے۔ ہجرت کا اشارہ اس وقت ملا جب ظلم وستم کی انتہا ہوگئی اور حجت تمام ہوگئی۔

آپؐ نے دعوت کی توسیع اور ہجرت کے لئے مناسب مقام کی تلاش کے بعد اجازت دی۔نجاشی کے بارے میں آپ مثبت رائے رکھتے تھے اور خیال تھا وہ دعوت کے لئے مددگار ثابت ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت جعفرؓ کی نپی تلی دعوتی تقریر کے بعد اس نے مشرکین کے تحفے تحائف، درباریوں کی ناراضگی کے باوجود واپس کردیئے اور مہاجرین کو رہنے اور کام کرنے کے مواقع بھی فراہم کئے۔

قرآن دعوت کے لئے ایک کارگر اور معجزاتی ذریعہ تھا۔زبان، بیان اور ادب میں دنیا کی شاید ہی کوئی قوم عربوں کا مقابلہ کرسکے لیکن عرب قرآن کا مقابلہ نہ کرسکے۔قرآن زبان، مضامین، اسلوب اور آہنگ کے لحاظ سے نظم اور نثر کے درمیان ادب کی ایک تیسری نادر قسم ہے، جو دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔آج بھی عربی جاننے والوں کے لئے قرآن ایک جادو ہے۔ پہلے بھی تھا اور آئندہ بھی رہے گا۔ وہ جتنے اونچے مضامین ایک نادر اسلوب اور دلکش آہنگ میں بیان کرتا ہے کوئی انسان ایسی گفتگو کر ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار عربوں کو چیلنج کرتا ہے کہ کوئی ایک سورہ یا ایک آیت ہی لے آؤ۔طفیل بن عمر دوسی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ مکہ آیا تو مشرکین اس کے پیچھے پڑ گئے اور کہا کہ محمدؐ کی بات نہ سننا، وہ جادو پیش کرتا ہے، طفیل قائل ہوگیا، چنانچہ جب خانہ کعبہ کی طرف جاتا تو کان میں روئی ڈال لیتا، مگر ایک بار حضورؐ کے پاس سے گزرا، آواز کانوں سے ٹکرائی، اچھی لگی اور رک گیا، پھر سوچا میں شاعر ہوں، عقل رکھتا ہوں کیوں نہ ان کی بات سن جائے، جب آپ گھر جانے لگے تو آپ کے پیچھے ہولیا اور گھر جا کر پورا واقعہ بتایا۔آپؐ نے اسے اسلام سمجھایا اور قرآن پڑھ کر سنایا، اس نے کہا خدا کی قسم اس سے بڑھ کر اچھا کلام میں نے کبھی نہیں سنا، اور وہ مسلمان ہوگیا۔

قریش نے عتبہ بن ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا، وہ حضورؐ کے پاس آیا اور نہایت نرم انداز میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آپ شریف آدمی ہیں، شریف اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن آپ نے قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے اس سے آپ کا کیا مقصد ہے؟ اگر آپ دولت کے خواہش مند ہیں تو ہم آپ کو دولت دینے کے لئے تیار ہیں، اگر آپ کسی خوبصورت عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں، اگر آپ حکومت یا سرداری چاہتے ہیں تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں۔عتبہ جب اپنی تقریر ختم کرچکا تو آپؐ نے سورۃ حم سجدہ کی آیتیں تلاوت فرمائیں اور آپ جب اس آیت پر پہنچے ''فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُکُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُوْدَ ''تو عتبہ کا رنگ فق ہوگیا اور کہا کہ ایسا نہ کہو۔اس نے حضورؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور جب حضورؐ نے سجدہ کیا تو اس نے بھی سجدہ کیا۔

طائف حضورؐ کی دعوتی زندگی کا ایک اہم سنگ میل ہے، جب مکہ والوں نے یہ ثابت کردیا کہ وہ اب مزید حضورؐ کی بات نہیں سنیں گے اور اپنے دروازے بند کرلئے، بالفاظ دیگر جب ان پر حجت تمام ہوگئی تو آپ قریب کی بستی طائف تشریف لے گئے، آپؐ نے راستے میں قبیلہ بنی بکر کو دعوت دی، اس کے بعد بنو قحطان کے پاس گئے، ان کو بھی اسلام کی دعوت دی، مگر ان دونوں نے انکار کیا اور لیت ولعل سے کام لیا پھر آپؐ طائف گئے،

سرداران طائف میں عبد یالیل، اس کے بھائی مسعود اور حبیب بنوثقیف کے رئیس تھے اور بااثر تھے۔ ان کو آپ نے دعوت دی، انہوں نے نہ صرف یہ کہ آپ ؐ کا مزاق اڑایا اور جملے چست کئے اور بات کرنے سے انکار کردیا، بلکہ اوباشوں کو حضورؐ کے پیچھے لگادیا۔ وہ آپ کو گالیاں دیتے، پتھر مارتے شہر کے باہر تک لے آئے۔ آپ ؐ کی پنڈلیاں پتھروں کی مار سے لہولہان ہوگئیں اور جوتیاں خون سے تر بتر ہوگئیں۔ آپ عتبہ بن ربیعہ کے باغ میں پہنچے تو آرام کے لئے بیٹھ گئے، وہیں پر پہاڑوں کا فرشتہ آیا اور کہا کہ آپ کہیں تو میں پہاڑ اٹھا کر ان کے اوپر ڈال دوں، مگر آپ ؐ نے منع فرمایا اور کہا کہ ان کی اولاد ایمان لائے گی۔ قربان جایئے نبی رحمتؐ پر آپ دوسری نسل کو اسلام کے سائے میں دیکھ رہے تھے اور پہلی نسل پتھر برسا رہی تھی۔ آپ ؐ نے اللہ سے دعا کی، الٰہی میں اپنی قوت کی کمی، اپنی بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلے میں اپنی بےبسی کی فریاد تجھ ہی سے کرتا ہوں تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

آپ ؐ کی حالت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے رات کو مقام نخلہ میں قیام کیا، جہاں جنوں کا قافلہ قرآن سن کر ایمان لایا، لیکن آپ مکہ نہ جاسکے۔ آپ ؐ نے مختلف سرداران قریش کو پیغام بھیجا، مگر کسی نے توجہ نہ دی، بالآخر مطعم بن عدی نے آپ ؐ کو پناہ دی اور وہ لینے آیا اور آپ ؐ کو لے کر مکہ میں داخل ہوا۔ اس کے لڑکے ننگی تلواریں لے کر خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے، اور مطعم نے اس کا اعلان کیا۔ سرداران قریش نے پوچھا تم ان کے رشتہ دار ہو، اس نے کہا ہمارا کوئی تعلق نہیں مگر میں ان کا حمایتی ہوں اور انہیں امان دیتا ہوں، جب تک وہ میری حمایت میں ہیں کوئی نظر اٹھا کر انہیں دیکھ نہیں سکتا۔

اتنے سخت حالات میں بھی آپ ؐ خاموش نہیں ہوئے اور آنے والے قبیلوں کو دین اسلام کی دعوت دیتے رہے، خاص طور پر حج پر آنے والے قبائل سے آپ ملاقات کرتے اور انھیں اسلام کی دعوت دیتے، مگر ابولہب اور ان کا گروپ آپ کے ساتھ لگا رہتا اور آپ کی باتیں سننے سے روکتا۔

آپ ؐ نے بنوعامر، بنوشیبان، بنوکلب، بنومحارب، فزارہ، غسان، سلیم، عبس، حارث، عذرہ، ذہل، مرہ قبائل کو اسلام کی دعوت دی۔ آپ بنوکندہ، بنوعبداللہ اور قبیلہ بنوحنیفہ کی بستی میں بھی گئے مگر ان لوگوں نے آپ سے بہت برا سلوک کیا۔

اسلام کے آگے بڑھنے کی رفتار جاری رہی، حبشہ سے ایک وفد آیا، اس کو آپ ؐ نے ایمان کی دعوت دی، وہ مسلمان ہوگیا، پھر مدینہ سے لوگ آتے رہے اور اسلام قبول کرتے رہے اور چند ہی سال میں مدینہ اسلام کے لئے تیار ہوگیا اور حضورؐ نے مکہ کو الوداع کہا اور مدینہ میں قیام فرمایا۔

مدینہ میں آپ کی دعوت کا انداز بدل گیا۔ مکہ میں آپ ؐ داعی، مربی، قائد اور نبی ورسول تھے مگر مدینے میں آپ ؐ ان اوصاف حمیدہ کے ساتھ ساتھ، سپہ سالار لشکر، منتظم اور حکمراں بھی تھے۔ فوراً آپ مدینہ کو دشمنوں سے محفوظ کرنے اور کسی بھی ناگہانی حملہ سے بچانے کے لئے تدبیریں کرنے لگے۔ یہود اور دیگر قبائل سے معاہدات

کئے اور انفارمیشن کا خفیہ نظام بنایا تا کہ دشمنوں کی حرکتوں کی اطلاع ہوتی رہے۔ چھوٹے چھوٹے سریہ مختلف صحابہؓ کی قیادت میں مدینہ کے اطراف بھیجتے رہے تا کہ دشمن خوف زدہ رہیں اور آپ بھی ذہنی طور پر تیار رہیں، اس طرح آپ نے مدینہ میں اسلام کو کافی وسعت دی۔

ہجرت کے دوسرے سال ہی بدر کا واقعہ پیش آیا۔ بہانہ ایک قافلہ بنا، لیکن جیسا کہ سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے قافلہ تو گزر گیا، مگر دونوں طرف کی فوجیں بدر کے میدان میں اکٹھی ہوگئیں۔ نبیؐ نے فرمایا مکہ نے اپنے جگر گوشے اور منتخب لوگ تمہاری طرف بھیجے ہیں۔ان کا مقابلہ کرنے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ مہاجرین نے حمایت کی پھر آپ انصار کی طرف مخاطب ہوئے، حضرت سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ اگر ہم کو حکم دیں کہ سمندر میں کود پڑیں تو بلا دریغ ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔

بدر وہ پہلی جنگ تھی جس نے کفار کی کمر توڑ دی اور ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے، ۷۰رسردار مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے، مکہ میں کہرام مچ گیا، اس جنگ میں کفار کی قیادت کا خاتمہ ہوگیا، اور وہی اس جنگ کا مقصد بھی تھا اور یہ حضورؐ نے حاصل کرلیا تا کہ عوام کو اور سوچنے کا موقع مل سکے۔

ماہ ذی قعدہ ۶ رہجری میں آپ ایک ہزار سے زائد صحابہ کرام کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی جانب حدیبیہ کے لئے روانہ ہوئے، عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے ستر اونٹ ساتھ لئے۔ احرام کا باندھنا اور قربانی کے اونٹ کا ساتھ ہونا اس بات کی علامت تھی کہ آپ جنگ کے لئے نہیں بلکہ بیت اللہ کی زیارت کے لئے جارہے ہیں، قریش مکہ کو کسی طرح حق حاصل نہ تھا کہ کعبہ کی زیارت سے کسی کو باز رکھیں۔

قریش نے حضورؐ کو روکا اور لڑنے پر آمادہ ہوگئے مگر جب مسلمانوں کی پوزیشن بہتر دیکھی اور کسی اور قبیلہ نے ان کی حمایت نہیں کی تو وہ صلح پر آمادہ ہوگئے۔ صلح کے لئے سہیل کو بھیجا اور سہیل کے توسط سے قریش اور نبیؐ کے درمیان صلح کی شرطیں طے ہوگئیں، صلح کی تیسری شرط بہت اہم تھی اور حضورؐ کی نظر اسی شرط پر تھی۔

''عرب کی ہر ایک قوم اور ہر ایک قبیلہ کو اختیار ہوگا کہ وہ جس فریق کے ساتھ چاہے معاہدہ کرلے۔ جن قبائل سے معاہدہ ہوگا، ان پر بھی اس صلح نامہ کی شرائط اسی طرح نافذ ہوں گی۔ دونوں فریق قبائل کو اپنا ہم عہد اور حلیف بنانے میں آزاد ہوں گے۔''

چوتھی شرط مسلمانوں کو بڑی ناگوار تھی اور وہ یہ تھی کہ اگر قریش میں سے کوئی شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا تو وہ قریش کو واپس کیا جائے گا، لیکن اگر کوئی مسلمان قریش کے پاس آجائے گا تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

صلح حدیبیہ بظاہر ایک صلح نظر آتی ہے مگر اپنے نتائج کے لحاظ سے تحریکی زندگی کا ایک اہم موڑ اور پڑاؤ ہے۔ پہلی بار قریش نے تسلیم کیا کہ مسلمان ایک قوت ہیں اور عرب میں ایک مضبوط فریق ہیں، ان کو نظر انداز کرنا اب

بہت ہی مشکل ہے۔ فتح مکہ کی اصل بنیاد صلح حدیبیہ ہے جس وقت یہ صلح ہو رہی تھی اور صحابہ کرامؓ پیچ وتاب کھا رہے تھے، اس وقت حضورؐ کی نگاہیں عرب کے ۱۰ر کلومیٹر کے رقبہ میں اسلام کو پھیلتا ہوا اور غالب ہوتا ہوا دیکھ رہی تھیں، اور یہی ایک داعی کی نظر ہوتی ہے۔ حضورؐ کا ہر قدم اسلام کے غلبہ اور توسیع کے لئے تھا۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ دو سال کی انتہائی قلیل مدت میں سیکڑوں قبیلے اسلام میں داخل ہو گئے اور سیکڑوں اسلام کے حلیف بن گئے اور جب ۸ھ میں حضورؐ نے مکہ کے لئے کوچ کیا، تو دس ہزار کا لشکر حضورؐ کے ہمراہ تھا، اور قرآن بار بار کہہ رہا تھا: اے نبی ہم نے آپ کو ایک عظیم فتح سے ہمکنار کیا۔

آپؐ نے صلح حدیبیہ کی دو سالہ مدت میں اسلام کی توسیع واشاعت کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھایا، آپؐ وقت کے نبی اور مدینہ کے حکمراں بھی تھے۔ آپؐ نے بادشاہوں کو خطوط لکھے اور اسلام کی دعوت دی۔ اسلام کو مکہ اور مدینہ کے حدود سے نکال کر بین الاقوامی بنا دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اسلام جلد ہی بین الاقوامی حیثیت اختیار کرے گا اور یہ صحابہ کرامؓ کے لئے ایک اشارہ بھی تھا کہ بہت جلد ان نشانوں کو پورا کر لینا ہے۔ شاہ حبش کو آپ نے خط لکھا اور اسلام کی دعوت دی، وہ مسلمان ہو گیا۔

آپ نے ہرقل شاہ روم کے پاس قاصد بھیجا۔ ہرقل نے آپؐ کے ایلچی سے نہایت مروت اور عزت کا برتاؤ کیا، آپ کے خط کی تکریم کی، مگر سلطنت کی لالچ اور عیسائیوں کی مخالفت کے خوف سے علانیہ اسلام قبول نہ کر سکا۔ مقوقس شاہ مصر واسکندریہ کے پاس حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کو بھیجا۔ مقوقش شاہ مصر نے آپ کے ایلچی اور خط کی بڑی عزت کی، جواب میں آپ کو نہایت مودبانہ عریضہ لکھا۔ ایک خلعت، ایک خچر اور دو لونڈیاں آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ خط کے ساتھ روانہ کیں۔ منذر بن ساویٰ شاہ بحرین کے پاس حضرت علاء بن حضرمی کو بھیجا۔ منذر بن ساویٰ نے بھی آپؐ کے خط اور ایلچی کے ساتھ تعظیم کا برتاؤ کیا۔ شاہ عمان کے پاس حضرت عمرو بن عاص کو بھیجا۔ شاہ عمان نے آپؐ کے خط کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ ھوزہ بن علی شاہ یمامہ کے پاس حضرت سلیطؓ بن عامری کو بھیجا، یہ بھی اسلام میں داخل ہو گیا۔ حارث بن الشمر غسانی شاہ دمشق کے پاس حضرت شجاع بن وہبؓ کو بھیجا۔ حارث بن عبد کلال حمیری شاہ یمن کے پاس مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کو بھیجا۔ کسریٰ شاہ فارس کے پاس حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی کو بھیجا۔ کسریٰ شاہ فارس نے آپ کے خط کو چاک کر دیا اور حضرت عبداللہ بن حذافہ کے ساتھ گستاخانہ برتاؤ کیا، آپؐ نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اس کی سلطنت چاک کر دی جائے۔ اس طرح بہت تھوڑی مدت میں قرب وجوار کے حکمرانوں کے پاس اسلام کی دعوت اور پیغام پہنچ گیا۔

فتح مکہ اسلام کے غلبہ کی علامت ہے، ۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ اور مکہ کے فتح ہوتے ہی اسلام کے غلبہ کا جھنڈا لہرانے لگا اور حضورؐ نے یہ آیت پڑھی جاءَ الحقُ وزهق الباطلُ ان الباطلَ كان ذهوقاً، اسلام آ گیا اور باطل مٹ گیا اور باطل تو مٹنے ہی کے لئے تھا۔ اس طرح نبیؐ نے اللہ کی تائید ونصرت سے بڑی تھوڑی مدت میں اسلام کو غالب کر دیا، درود ہو آپؐ پر، سلام ہو آپؐ پر۔

ادب اسلامی

کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا کردار

سماج کی تعمیر وتشکیل میں ادب اور فنون لطیفہ کی کیا اہمیت ہے؟

اسلام ادب اور فنون لطیفہ کے سلسلے میں کیا اصولی ہدایات پیش کرتا ہے؟

ادب اسلامی کیا ہے؟ اس سے ہم کیا چاہتے ہیں؟کیا یہ اصطلاح استعمال کرنا درست ہے؟

مدراس اسلامیہ کا ادب یا ادب اسلامی کے فروغ میں کیا کردار رہا ہے؟

مدارس اسلامیہ (اور ان سے وابستہ طلبہ، اساتذہ اور فارغین) ادب اسلامی بالخصوص اردو ادب اسلامی کے فروغ میں کیا کردار ادا کرسکتے ہیں؟

یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو ''ادب اسلامی کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کے کردار'' سے متعلق سامنے آتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ان سوالات پر اچھی اور مفید گفتگو کی گئی ہے، امید کی جاتی ہے کہ اس سے ہمارے درمیان ایک سنجیدہ علمی بحث کا آغاز ہوگا۔ (مدیر)

● **ڈاکٹر ضیاء الرحمن فلاحی**، صدر شعبہ اردو، الجامعہ الاسلامیہ شانتاپرم۔
کیرلا۔ای میل:ziaurahmanmadani@gmail.com،Mob:09526029212

سماج کی تعمیر اور تشکیل نو میں ادب اور فنون لطیفہ کی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔ دراصل ادیب و فنکار اپنے اندر ایک ساحرانہ طاقت رکھتا ہے، جس کے مثبت اور تعمیری استعمال سے وہ حیات انسانی کے بکھرے گیسو سنوار سکتا ہے۔فن اور زندگی کا گہرا رشتہ ہے۔شعر وادب کا ملکہ اور ذوق خدا کا عظیم عطیہ اور ناقابل تسخیر ہتھیار ہے، جس سے افکار ونظریات کی اصلاح کے ذریعے معاشرے میں صالح انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ باطل اور غلط نظریات کی جڑ پر تیشہ چلا کر صحت منداور توانا اقدار کی آبیاری کی جاسکتی ہے۔اقبالؔ نے شاعری (جو فنون لطیفہ میں سب سے لطیف فن ہے) کے سماج پر پڑنے والے اثرات کا اپنے اشعار میں بلیغ پیرائے میں اظہار کیا ؎

شاعر دلنواز بھی بات کہے اگر کھری ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری
شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

امر واقعہ ہے کہ اسلام نے تاریخ کے ہر دور میں اپنی پیغام رسانی اور باطل نظریات کو شکست دینے کے لیے ادب کی طاقت کو استعمال کیا ہے۔ چنانچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے برپا کردہ انقلاب میں خود قرآن مجید کی ادبی حیثیت کے علاوہ جاہلی شعراء اور ادباء کی طرف سے اسلامی تحریک کے خلاف اٹھائے گئے طوفان کے جواب میں قائد تحریکؐ نے اپنے شاعروں اور ادیبوں کو میدان میں اتارا، اور حسان بن ثابتؓ کے لیے دعا کی:

اللّٰھم أیّدہ بِرُوحِ القُدس

جہاں تک ادب اور فنون لطیفہ کے سلسلے میں اسلام کی اصولی ہدایات کا تعلق ہے تو اس ضمن میں جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو پہلی حقیقت یہ بتائی جاتی ہے کہ بقا اور ثبات صرف ان افکار ونظریات اور تخلیقات کے لیے ہے جو انسانیت کے لیے باعث فلاح ہوں۔ غیر صحتمند، مفسد نظریات، فنون اور پیغامات جھاگ کی طرح اڑ جاتے ہیں۔

فأمّا مَا یَنفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الأرضِ۔ (الرعد:۱۷)

دوسری رہنمائی اس ضمن میں یہ ہے کہ ادب اور آرٹ کی طاقت کے ذریعے منکر کا سدباب کیا جائے اور معروف کو قائم کیا جائے۔''منکر'' کا لفظ شر وفساد کی تمام چھوٹی بڑی اشکال کا احاطہ کرتا ہے۔ اسی طرح ''معروف'' سے وہ تمام نیکیاں مراد ہیں، جن کا تقاضا انسانی فطرت کرتی ہے اور جو کائنات اور زندگی کی ابدی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہیں۔

قرآن زبان وقلم کے استعمال کے سلسلے میں ایک اصولی ہدایت یہ دیتا ہے کہ:

قُولوا لِلنّاسِ حُسنًا۔یعنی اپنی گفتار اور بیان میں حسن وجمال پیدا کرو۔کلام الٰہی کا یہی حسن ہے جو

معراج کمال کو پہنچ کر ادب وشعر میں ڈھل جاتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید نے دنیائے ادب کا ایک گھناؤنا کردار یہ پیش کیا ہے کہ وہ لہوالحدیث کا متلاشی رہتا ہے۔ اس سے مراد وہ قصے کہانیاں اور جذبات وتاثرات ہیں جن سے کھوکھلی تفریح کے سوا انسان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ یہ وہ گھٹیا ادب ہے، جس کا مقصد محض ذہنی عیاشی ہے۔ قرآن ایسے مشغلوں سے ادیبوں اور فنکاروں کو دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ جو بے مقصد تفریح کے ذریعے انسانوں کو فرائض وواجبات سے غافل کر دیتے ہیں۔

قرآن اس ادیب کے کردار کو بھی مسترد کر دیتا ہے جو خدا اور اس کے قانون سے بے نیاز ہو کر فواحش پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی فکر اعتدال وتوازن سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کا فن رخش بے عناں کی طرح آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ شعر وادب اور دیگر فنون لطیفہ کی تمام تخلیقات جو گھٹیا خواہشات کی مظہر بن کر شکم اور فرج کے مسائل تک محدود ہو جاتی ہیں، اسلام ان کی طرف نظر التفات نہیں کرتا۔ اسی طرح اسلام کی نگاہ میں وہ لوگ انسانیت کے دشمن اعظم ہیں جو معاشرے میں فحش کی اشاعت کرتے ہیں۔ ادب اور فنون لطیفہ کے وہ تمام اسالیب جو آدمی کو اس کے اخلاقی مرتبے سے غافل کر کے نفسانیت کی پستی میں جا گرائیں، اور جن کے ذریعہ سفلی جذبات میں نا قابل انضباط ہیجان پیدا ہو، اور جو ذہن کو بے راہ روی کی طرف دھکیل دیں، اسلام میں ان کی قطعاً گنجائش نہیں۔ لا تقربوا الزنا کہہ کر اس نے ان تمام محرکات پر قدغن لگا دی ہے جو بدکاری اور نظر بازی کو فروغ دینے والے ہوں۔

زندگی کی طرح ادب وفن میں بھی خلوص وصداقت بڑی قدریں ہیں۔ لہٰذا ادیبوں کو چاہیے کہ انہی خیالات کو پیش کریں جن سے ان کو ذاتی واقفیت ہو، ولا تقفُ مالیس لك به علم۔ اسی طرح وہ ادیبوں اور فنکاروں سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ وہ جن اصولوں کو پیش کریں، ان کو خود اپنے کردار سے بھی ثابت کریں۔ وہ محض فی کلّ وادٍ یَهِیمون کے الزام سے ہی بچنے کی فکر نہ کریں بلکہ یَقُولُونَ مَالاَ یَفْعلُونَ کے الزام سے بھی اپنا دامن پاک رکھنے کی کوشش کریں۔ کَبُرَ مَقتًا عِند اللّٰہ أن تَقُولُوا مَالاَ تَفْعَلُونَ۔

جہاں تک ادب اسلامی کے مفہوم کی بات ہے تو اس سلسلے میں ادب اور زندگی کے رشتے کو سمجھنا ضروری ہے۔ ادب درحقیقت زندگی کی تفسیر اور تنقید کا نام ہے۔ ظاہر بات ہے کہ تفسیر وتنقید کسی خاص نقطۂ نظر ہی سے ہوگی۔ کوئی ادیب خواہ کتنا ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو، زندگی پر جب نظر ڈالے گا تو اپنے آپ کو کسی نہ کسی زاویہ نگاہ کا پابند پائے گا۔ حیات وکائنات کے متعلق کچھ خاص تصورات رکھتا ہوگا اور اسی کے مطابق عام انسانی مسائل سے بحث کرے گا۔ اسلامی ادب سے مراد وہ ادب ہے جس کی اساس حیات وکائنات سے متعلق ان تصورات واقدار پر ہے جو اسلام نے عطا کیے ہیں۔ جو ادیب کو انسانی فطرت سے ہم آہنگ رکھتے ہیں اور ان پر اعتقاد اس کے ذوق ووجدان کو غیر متوازن ہونے سے بچاتا ہے۔

اسلامی ادب کی اساسی قدروں میں سب سے مقدم خدا کے وجود کی صداقت پر یقین ہے۔ یہ وہ منبع حسن

ہے جس کو نظر انداز کر دینے سے انسان اصل حقیقت کو گم کر دیتا ہے۔ کیونکہ جو شخص اپنی فطرت اور مشاہدے پر پردہ ڈال کر اس کائنات کے پیچھے کار فرما قادر مطلق، حکیم اور مدبر سے اپنا ناطہ توڑ لیتا ہے یا اس کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کی ذات کو دنیا سے بے تعلق خیال کرتا ہے، اس کی ہر بات حقیقت سے دور ہو جاتی ہے۔ ایسا شخص یا تو خود کو ہی آخری معیار قرار دے کر اپنے آپ کو خدائی کے منصب پر بیٹھا لیتا ہے یا پھر دوسری انتہا پر پہنچ کر اپنے آپ کو دوسرے مادی سہاروں کے آگے جھکا دیتا ہے۔

وحدت بنی آدم کا نظریہ بھی ان اساسی قدروں میں شامل ہے جو اسلامی ادب کی پہچان ہیں۔ اس کی رو سے چونکہ انسان کی تخلیق آدم سے شروع ہوتی ہے، اس اعتبار سے اسلامی ادب انسان کی اصل فطرت، اس کے داعیات و مطالبات کو حیوان کے بجائے انسان ابن انسان کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ اس بنیاد کی رو سے تمام انسان بھائی بھائی قرار پاتے ہیں اور انسانی ہمدردی و بھائی چارگی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

تیسری بنیادی حقیقت جس کی اساس پر اسلامی ادب زندگی کی تفسیر کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کائنات کی دوسری مخلوقات کی مانند بالکل مجبور نہیں ہے بلکہ اس کو کچھ ارادہ و اختیار بھی حاصل ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ اپنے آپ کو مجبور و بے بس سمجھتے ہیں۔ ان پر مایوسی و قنوطیت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

چوتھی بنیادی حقیقت آخرت ہے۔ یہ بھی ادب پر اپنے گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ اسلامی ادب جس حیثیت سے اس قدر کو اجاگر کرتا ہے، اس سے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کا یقین و ایمان، احساسات میں زبردست انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے اندر احساس ذمہ داری ابھرنے لگتا ہے اور وہ ظلم و ناانصافی سے متنفر ہونے لگتا ہے۔

تجربے اور مشاہدے کے لیے یہ وہ مضبوط بنیادیں ہیں جن پر ادیب کا جمالیاتی ذوق پوری قوت کے ساتھ اور صحیح سمت میں پروان چڑھ سکتا ہے۔ دنیا نے آج تک انہی ادیبوں کی تخلیقات کو غیر فانی ادب میں شمار کیا ہے جو جمالیاتی حس کے پہلو سے زیادہ سے زیادہ قریب رہے ہیں۔

اسلامی ادب پر گفتگو نامکمل رہے گی اگر یہ بات بھی ساتھ ہی عرض نہ کر دوں کہ کسی ادب کی قدر و قیمت کا انحصار اس کے موضوع پر ہوتا ہے، اس لحاظ سے اسلامی ادب کا گراں مایہ ہونا محتاج بیان نہیں لیکن اسلامی ادیب کو یہ بات ہمیشہ یاد رہنی چاہیے کہ وہ واعظ یا ناصح نہیں بلکہ ادیب ہے۔ ادب بھی دیگر فنون لطیفہ کی طرح اپنے خاص اصول و ضوابط رکھتا ہے، جن کی نگہداشت ضروری ہے۔ ادب میں ہیئت کے حسن و جمال سے بے اعتنائی جائز نہیں کیونکہ اس کی دلکشی بہت کچھ ہیئت میں ہی مضمر ہوتی ہے۔

گو کہ اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس عام طور پر مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم کا جز نہیں ہے۔ اردو کی تعلیم کا جو نظم ہے وہ ابتدائی درجات تک محدود ہے۔ البتہ سب سے بڑی دینی درس گاہ دارالعلوم دیو بند میں شیخ الہند اکادمی کے تحت زبان و ادب وغیرہ سے متعلق دو سالہ نصاب رائج ہے جس میں دورۂ حدیث کے بعد خواہش

مند طلبہ کا داخلہ ہوتا ہے۔ جامعۃ الفلاح کے نصاب میں بھی اردو ادب کا ایک مضمون شامل نصاب ہے۔ عام طور پر مدارس میں عربی زبان و ادب کی تعلیم پر زور صرف کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ مدارس نے اردو زبان ہی نہیں اردو میں اسلامی ادب کے فروغ میں بھی اہم اور قابل ستائش کردار ادا کیا ہے۔ بیشتر کلاسیکی شعراء کا تعلق بھی مدارس ہی سے رہا ہے۔ اردو غزل کے بابا آدم ولی دکنی مدرسے کے فیض یافتہ تھے۔ اسی طرح داغ دہلوی، میرؔ، غالبؔ، دردؔ، مومن سبھی مدرسے کے پروردہ تھے۔ اردو میں ناول کی تاریخ لکھنے والے مولوی ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزادؔ، مولانا الطاف حسین حالیؔ، نظیرؔ، اکبرؔ الٰہ آبادی، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، وحیدالدین سلیم وغیرہ بھی مدارس اسلامیہ ہی کی دین وعطا ہیں۔ ماضی قریب میں جن ادیبوں نے اسلامی ادب کے گلشن کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی ان میں عامر عثمانی، ماہر القادری، نعیم صدیقی، پروفیسر عبدالمغنی، سید عبدالباری شبنم سبحانی، ضیاء الدین اصلاحی، انور اعظمی، عروج قادری، طیب عثمانی ندوی، مدارس اسلامیہ کے فیض یافتہ رہے۔ ان ادیبوں نے ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت وغیرہ مادی وملحدانہ تحریکات ونظریات کی آندھی میں اسلامی ادب کا چراغ جلائے رکھا۔ نامساعد اور ناسازگار حالات میں ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر جس طرح انہوں نے کام کیا وہ کسی مجاہدے سے کم نہیں ہے۔

اس وقت بھی اسلامی ادب کی بے لوث و بے بہا خدمت انجام دینے والوں میں مدارس اسلامیہ کے فیض یافتگان شامل ہیں۔ وہ نثر ہی نہیں نظم کے مختلف اصاف میں قلم کا جادو جگا رہے ہیں۔ ان کی کوششوں سے ادب اسلامی کو ایک وقار واعتبار حاصل ہے۔ اسلامی ادب نے، جس کو بامقصد اور تعمیری ادب کا بھی نام دیا جاسکتا ہے، فنکاروں کے ساتھ ساتھ قارئین اور سامعین سے بھی اپنی اہمیت منوالی ہے۔ اسلامی ادب کے ان خادموں میں ابوالبیان حماد عمری، محسن عثمانی، ندوی، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، ابوالکلام قاسمی، حقانی القاسمی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

ادب اسلامی کے اس کارواں میں فلاحی برادران کی شمولیت بھی خوش آئند ہے۔ ادبی محاذ پر نمایاں کارکردگی پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم (شعبۂ اردو علی گڑھ) کا نام سرفہرست ہے، جنھوں نے ''علمی نثر'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا اور اے ایم یو میں لکچرر تھے۔ افسوس کہ جوانی ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دوسرا نمایاں نام عزیز نبیل (حال مقیم قطر) کا ہے، جو ادبی وتحقیقی رسالہ ''مجلّہ دستاویز'' کے مدیر اعلی ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''خواب سمندر'' کے نام سے شائع ہوکر خاص وعام سے خراج تحسین حاصل کرچکا ہے۔ ان کی کتاب ''فراق گورکھپوری، شخصیت شاعری اور شناخت'' کو NCPUL دہلی نے حال ہی میں بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ عزیز نبیل نے بہت کم وقت میں عالمی اردو ادب میں اپنی نمایاں پہچان بنالی ہے۔ دیگر فلاحی برادارن میں عبدالرشید راشد اعظمی نے ''مولانا عبدالسلام ندوی کی سوانح اور ادبی خدمات شعر الہند کے حوالے سے'' پر جامعہ ملیہ سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ''شکستہ خاطر'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ انہوں نے ''میخانہ عجم'' کے نام سے رباعیات عمر خیام کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے، جس پر اردو اکیڈمی دہلی نے ان کو

انعام سے نوازا ہے۔ امتیاز وحید نے ''پیروڈی کا فن'' پر ایک کتاب لکھی جس کو اردو اکیڈمی دہلی نے انعام کا مستحق قرار دیا۔ ڈاکٹر محمد نعیم کا تحقیقی کارنامہ ''فرہنگ کلام سودا'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر کی کتاب ''اردو زبان کی تدریس اور اس کا طریقہ کار'' چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سہیل (اردو میں تجزیاتی تنقید) ڈاکٹر مونس (اردو میں تأثراتی تنقید) ابوارشد اعظمی (اردو میں ترقی پسند تنقید۔ نظریہ وعمل) نے تنقید سے متعلق موضوعات پر تحقیقی کام کیا ہے۔ راقم الحروف نے ''اقبال اور شوقی کے افکار کا تقابلی مطالعہ'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ قلمبند کیا ہے۔ حیات نو کی ادارت سے وابستہ راشد حامدی بھی تحریک ادب اسلامی سے وابستہ اچھے ادیب وشاعر ہیں۔

ادب اسلامی کے فروغ کے سلسلے میں مدارس کے کردار سے متعلق مذکورہ بالا قابل قدر خدمات کے پہلو بہ پہلو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مدارس اسلامیہ نے اسلامی ادب کے فروغ میں مطلوبہ کردار ادا نہیں کیا ہے۔ مدارس کے فیض یافتگان نے ادب کے میدان میں جو کارکردگی دکھائی ہے یا دکھا رہے ہیں۔ اس میں مدارس سے زیادہ ان کی ذاتی دلچسپی اور لگن کا دخل ہے۔ مدارس میں شعر وادب کی اعلیٰ اور معیاری تعلیم وتدریس یا فنی تربیت کا کوئی خاص نظم نہیں۔ بلکہ مدارس کے بعض فارغین شعر وادب کو لایعنی مشغلہ تصور کرتے ہیں، تبھی تو حفیظ میرٹھی کو کہنا پڑا تھا۔

دیکھو یہ پندار تقویٰ ٹھیک نہیں ہے مولانا
شعروادب کا ذکر چھڑے تو چیں بہ چیں ہوجاتے ہو

وہ صحیح ادبی ذوق اور شعری نزاکتوں سے عدم واقفیت کی بنا پر رعنائی خیال کو گناہ ٹھہرا دیتے ہیں، تأمّل نہیں کرتے اور کبھی کبھی کفر وفسق کے فتوے بھی داغ دیتے ہیں۔

میرے خیال میں مدارس ادب اسلامی کے فروغ وارتقا میں بہتر کردار ادا کرسکتے ہیں اس کے لیے اعلیٰ درجات کے نصاب میں اردو ادب کے لیے گنجائش نکالنی چاہیے۔ تعلیم وتدریس کے لیے شعر وادب سے اچھی واقفیت رکھنے والے استاد فن کی خدمت حاصل کرنی چاہیے جو طلبہ کے اندر جوہر قابل کی جستجو کر کے ان کی تربیت کرسکے۔ ادارۂ ادب اسلامی ہند یا ورابطہ ادب اسلامی کی ذیلی یونٹس قائم کی جائیں۔ ادبی نشستیں، ادبی کارگاہ، ادبی سمینار اور کانفرنسیں، انعامی مقابلے اور محفل مشاعرہ کا انعقاد وغیرہ چند ایسے ذرائع ہیں جن سے ادب اسلامی کے فروغ میں مدد لی جاسکتی ہے اور یہ کام طلبہ وطالبات دونوں میں ہونا چاہیے۔

● **زبیر ملک فلاحی**، اسلامک اسکالر، حال مقیم لکھنؤ، یوپی۔ موبائیل نمبر: 9889650087

آپ کا ارسال کردہ سوال نامہ موصول ہوا۔ سارے سوالات ادب اسلامی اور مدارس اسلامیہ اور ان کے

فارغین کے فروغِ ادب میں کردار کے بارے میں ہیں۔

بھئی! نہ تو میں ادیب ہوں اور نہ ہی ادب کا پارکھی۔ اس کے باوجود آپ کا اصرار کہ جواب دو۔ خدا معلوم آپ کو مجھ سے کیا توقعات ہیں! اللہ آپ کے حسن ظن کو پورا کرے۔ چند سطور حاضر خدمت میں۔ جو جگ ہنسائی کے لیے کافی ہوں گی۔ چھوٹوں کی ضد بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ میں کیا اچھے اچھوں کے جھال کھول دیتی ہے۔

آپ کے سوال نامے میں اسلامی ادب کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور ہمارے یہاں باقاعدہ اس کا استعمال ہوتا رہا ہے بلکہ اس کی بنیاد پر اچھی خاصی سرگرمیاں ماضی میں بھی جاری تھیں اور مستقبل کے منصوبے بھی بنائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ اصطلاح مناسب نہیں۔ ادھر جب سے اسلامی تنظیمیں اور جماعتیں بنی ہیں اسی وقت سے 'اسلامی' کا لاحقہ سابقہ بہت استعمال ہونے لگا ہے۔ اس سے ذہنی تسکین ہوئی ہوتو ہوئی ہو، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ الٹا نقصان ہی ہوا ہے۔

ادب کے سلسلہ میں اسلامی اور غیر اسلامی کا معاملہ عجیب ہے، یہ تو ہوا پانی اور روشنی کی طرح عام چیز ہے۔ اگر ہم اسلامی ہوا، اسلامی پانی اور اسلامی روشنی نہیں استعمال کرتے، تو اسلامی ادب کیا بات ہوئی، ناحق ایک عام چیز کو ہم نے خاص کر لیا ہے۔ اس سے ہم نے خود کو بہت محدود کر لیا اور بے شمار فوائد سے اپنے کو محروم کر لیا۔ اس سے دراصل جتھا بندی اور گروہ بندی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ جو ہمارے کاز کے لیے مفید کے بجائے مضر ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ ردعمل کی بنیاد پر ہوا ہے۔ ماضی قریب میں جو مختلف نظام ہائے زندگی وضع ہوئے اور انھیں کی بنیاد پر مختلف تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے ادبی محاذ پر اپنی شناخت کے لیے ادبی سرگرمیوں کو اپنے حسب حال نام دے دیئے، انھیں کے جواب میں ہمارے بزرگوں نے یہ اصطلاح وضع کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماضی کے اچھے خاصے ذخیرے سے ہم نے ہاتھ دھولیا، حالانکہ ان سے مفر نہیں، نظریاتی تحریکوں کا مسئلہ یہ ہے کہ صرف محاذ جیتنا ہی مقصود نہیں ہوتا بلکہ اپنے طریقہ کار پر کاربند رہتے ہوئے سرگرم عمل ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ذرا آپ غور کیجئے کہ کیا مزدوروں اور غریبوں کے مسائل پیش کرنے کو ہم اشتراکی ادب مان سکتے ہیں؟ کیا اسلامی اصول ونظریات کے مطابق ہم سماج کے سارے مسائل پر بحث نہیں کر سکتے ؟

اقبالیات کا مطالعہ کیجئے تو عجیب رسہ کشی سے سابقہ پیش آتا ہے۔ بے چارے اقبال نے ''اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو'' کہہ دیا تو اشتراکی لے اڑے کہ اقبال بھی اشتراکی تھے، یا کم از کم اشتراکی رجحانات ان کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ یہ ایک بے ہودہ بات ہے۔ دراصل یہ اشتراکی ادب اور اسلامی ادب کی تقسیم اور اس تقسیم کو تسلیم کر لینے کا لازمی نتیجہ ہے۔

میں اس معاملہ کو اس طرح سمجھتا ہوں کہ ادب ایک آفاقی چیز ہے یہ انسان کا ایک ملکہ ہے۔ اب اس کا استعمال دوسری ملکاتِ بشریہ کی طرح صحیح اور غلط ہو سکتا ہے۔

یاد رکھئے کہ انسانیت بھی کوئی چیز ہے اور عالمی انسانی اقدار بھی اپنا وجود رکھتی ہیں جس طرح کوئی انسان

سڑا ہوا کھانا نہیں کھا سکتا اور اس میں اسلامی وغیر اسلامی کی کوئی بحث نہیں پیدا ہو سکتی، اسی طرح فاسد، تخریب پسند ادب بھی غیر انسانی اور عوام الناس کے لیے غیر مقبول ہے۔

اگر ہم اس کی کوئی تقسیم ہی کرنا چاہتے ہیں تو صالح اور مفید ادب بمقابلہ فاسد اور تخریب کار ادب کی تقسیم کر لیں۔ اگر اس کے علاوہ کوئی تقسیم کرتے ہیں تو یاد رکھئے کہ پھر تقسیم کی کوئی حد و نہایت نہیں رہے گی، ہمیں تقسیم در تقسیم کو تسلیم کرنا پڑے گا جو ظاہر ہے تعمیری چیز نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہم لوگوں نے عہد بعہد کی تقسیم پڑھا تھا۔ عہد جاہلی کا ادب، عہد اسلامی کا ادب، عہد بنو امیہ کا ادب وغیرہ وغیرہ۔ اب عہد جاہلی کے ادب میں ایسا نہیں ہے کہ ساری چیزیں یکسر غلط تھیں۔ اور عہد اسلامی میں بھی غیر مفید وغیر صالح ادب کی تخلیق کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ادب تو ظرف ہے جس میں خیر بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور شر بھی، صالح اور نافع بھی اور فاسد وغیر نافع بھی۔ اس میں بے چارہ ادب تو وہ تلوار ہے جو فقط کاٹتی ہے اب اگر کسی ڈاکو کے ہاتھ میں آ جائے تو موجب فساد ہو جاتی ہے اور کسی مجاہد کے ہاتھ میں آ جائے تو باعث خیر۔ اس میں اصل مسئلہ تلوار کا نہیں اس کے استعمال کا ہے۔

چونکہ میں کوئی ادیب اور تنقید نگار نہیں اس لیے اتنا ہی کافی ہے آگے حد ادب۔

ہاں آپ نے مدارس اسلامیہ اور ان کے فارغین کے کردار کے بارے میں بات کی ہے تو بھئی! مدارس کی بات کر کے آپ بے مزہ کر دیتے ہیں بلکہ بدمزہ کہئے تو زیادہ صحیح ہے۔

اگر آپ اردو زبان وادب کی پیدائش اور اس کے ارتقاء پر طائرانہ نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ علماء دین اور مشائخ ہی تھے جنھوں نے اس کی آبیاری کی اور اسے پروان چڑھایا۔ ابھی ماضی قریب تک یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی عالم ہو، مصلح ہو، مبلغ دین ہو اور ادیب نہ ہو، یہ افراتفری اب شروع ہوئی ہے کہ آپ منبر و محراب کے امین ہوں اور لا یفقہوا قولی کے مصداق ہوں۔

میری جہاں تک معلومات ہیں، کسی دینی مدرسہ میں اردو ادب نصاب میں شامل نہیں ہے، ہاں نوشت وخواند کی حد تک ضرور ہے۔ یہ پہلے بھی شامل نہیں تھا لیکن پہلے اردو گھر کی لونڈی تھی۔ اس کے لئے اتنے جتن کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن برا ہو جمود کا۔ استاد ازل نے سکھلا دیا بس وہی ابد تک کے لیے کافی ہے۔ اب حالات کی تبدیلی کے نتیجے میں جو اقدامات کرنے تھے ان کے لیے کور چشمی نے کوئی جگہ ہی نہیں چھوڑی۔ نتیجہ ہے کہ اب ایسی نسل اٹھ رہی ہے جو صحیح املاء لکھ لے تو لاکھ لوٹ۔ مجموعی ماحول تو ایسا ہو گیا ہے کہ اب 'خطبات' اور 'سلامتی کا راستہ' کی زبان کی تسہیل کی فرمائشیں ہو رہی ہیں۔ سائنس نے مواد کو اس قدر اہمیت دے دی کہ پیش کش بے معنی ہو گئی۔ ترسیل کسی طرح سے بھی ہو جائے بس کافی ہے۔ دل چاہے تو پتے میں کھا لو یا چینی کی رکابی میں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اب ہر جگہ بونے کا راج ہے۔ استغفر اللہ۔

آپ کہتے ہیں کہ مدارس کے فارغین اردو ادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہاں میں تو کہتا ہوں کہ انھیں اردو ادب تو دور کی بات، اردو زبان ہی پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ دور نہ جایئے صرف مسجدوں میں آویزاں وہ ہدایات ہی پڑھ لیجئے جو وضوخانے، بیت الخلاء اور دوسری جگہوں پر ہوتی ہیں۔ میاں کمال ہے کہیں کہیں اردو میں بھی یہ ہدایات ملیں گی، نہیں تو اللہ جھوٹ نہ بلوائے، صدفی صد دوسری زبان میں ہیں۔ یہاں زبان کے لالے پڑے ہیں آپ کو ادب کے فروغ کی سوجھی ہے۔

اگر بات دائرہ سے باہر نہ ہو رہی ہو اور لوگوں کی فضیحت کا ڈر نہ ہو تو اب وہ وقت آ گیا ہے کہ صاف کہہ دینا چاہیے کہ جس کا دل چاہے اردو پڑھے لیکن اگر مقصود دعوت اسلام ہے تو دوسری زبان اختیار کیجئے، بلکہ اس سے آگے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی بقا مقصود ہے تو دور زوال کی علامت سے چھٹکارہ پایئے۔ اسی نے ہمیں غیتو کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے اور ہم اپنے معاشرہ ہی میں ایک جزیرہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اور پھر میر و غالب کی آہ اور واہ سے ایک داعی کو کیا غرض ہو سکتی ہے۔ بے شمار اختلافات سے نجات مل جائے گی اور امت مسلمہ یکسو ہو جائے گی۔ میں دلیل نہیں توجہ دلا رہا ہوں جہاں مسلمان اس سے دور ہیں وہاں بہتر ہیں۔ تحریکی حلقہ میں کیرالہ ایک زندہ مثال ہے۔

عزیزم! میں نے الٹا سیدھا تمہاری ضد پر لکھ تو دیا اگر تم نے شائع کرنے کی بہادری دکھائی تو بلاشبہہ دونوں کی عاقبت روشن ہو جائے گی۔ اللہ ہم دونوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔

● **محمد اظہر الدین فلاحی**، الجامعۃ الاسلامیہ تلکھنا۔ موبائیل نمبر:
9565221704

سماج کی تعمیر و تشکیل میں ادب اور فنون لطیفہ کی اہمیت مسلم ہے۔ ادب اور فنون لطیفہ کے ذریعے انسانی اخلاقیات اور اقدار کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے، سماج کے افراد کو صالح بنایا جا سکتا ہے۔ ادب انسان کو انسان بنانے، اور جذبات کی تطہیر کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ ادب اور فنون لطیفہ کے ذریعے معیشت کا استحکام بھی ہوتا ہے، جس سے بلاشبہہ سماج کی ترقی ہوتی ہے اور اچھے سماج کی تعمیر و تشکیل میں مدد ملتی ہے۔ کیونکہ سرمایہ سماج کی تعمیر کے لیے سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

اسلام تخلیقیت کے اظہار کے جتنے بھی ذرائع ہیں، اس کی اجازت دیتا ہے، ادب اور فنون لطیفہ کے سلسلے میں اسلام کی چند اصولی ہدایات کچھ اس طرح سے ہیں۔ (۱) ایسا کوئی عمل نہ ہو، جس سے اللہ کی وحدانیت کا تصور متأثر ہو۔ (۲) انسانیت کے لیے نقصاندہ نہ ہو، بلکہ نفع کا پہلو پایا جاتا ہو۔ (۳) صالح اقدار اور اخلاق و کردار کے سلسلے میں معاون ہو۔

ادب اسلامی سے مراد جو انسان کو اللہ کا صالح بندہ بنائے اور اس سے ہماری مراد قرآن و حدیث، سیرت

کے علاوہ وہ علمی سرمایہ ہے جو اسلام اور اسلامی اقدار وروایات کے تعارف کا ذریعہ بنتا ہو، اور جس کو پڑھ کر اہل اسلام کو استقامت اور اطمینان کی دولت نصیب ہو۔ اور برادران وطن اسلام کی جانب راغب ہوں۔ اسی طرح ہر اس سرمایے کو بھی اسلامی ادب میں شمار کیا جائے گا، جس میں اسلامی نظریات اور افکار کا بیان ہو۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال، مولانا مودودی، مولانا آزاد، اور علامہ شبلی وغیرہ کی تحریریں۔

ادب اسلامی کے فروغ میں مدارس کا کردار اظہر من الشمس ہے۔ جملہ مدارس اسلامیہ کے نصاب میں ادب اسلامی کو کما حقہ اہمیت دی گئی ہے۔ حتیٰ کہ بعض مدارس کی انتہاء یہ ہے کہ ادب اسلامی کے علاوہ کسی دوسرے ادب کو اپنے نصاب میں جگہ تک نہیں دی گئی۔

مدارس اسلامیہ سے وابستہ افراد ادب اسلامی بالخصوص اردو ادب اسلامی کے سلسلے میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں، مثال کے طور پر دیہات میں پائے جانے والے مدارس اور مکاتب میں اردو کے ماحول کی ترویج واشاعت کا اہتمام۔ دوسری زبانوں کے لٹریچر کو اردو میں منتقل کرنے کا کام۔ سمینار اور ادبی نشستوں کا انعقاد، اور قومی کونسل وغیرہ سے اس کے سلسلے میں تعاون لینا۔ تدریس اردو کے سلسلے میں ورکشاپ کا اہتمام۔ مضمون نگاری کی مشق۔ حسب حال مجلات اور رسائل کا اجراء۔ طلبہ یونین کی جانب سے سالانہ میگزین کی اشاعت۔

● **ڈاکٹر ارشد جمال فلاحی**، لکچرر الفاروق یونانی میڈیکل کالج، اندور۔
موبائیل نمبر: 8147683299

ادب وفنون لطیفہ نے سماج ہی کے بطن سے جنم لیا، سماجی روایات، اقدار، مذہبی وغیر مذہبی رسوم ورواج، ثقافتی منظر نامے تاریخ اور جغرافیائی خدوخال اور زندگی وسماج سے جڑے لاتعداد شعبہ جات اس کا حصہ ہیں۔ سماج اور ادب کا وجود ایک دوسرے میں پیوست ہے۔ صحت مند سماج صحت مند ادب کو اور صحت مند ادب بہترین سماج کو جنم دینے کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن یہ تب ہی ممکن ہے جب ادب اور سماج اپنا بنیادی فرض پورا کریں۔

تمام فنون کا بنیادی منشا و مقصد زندگی، انسان اور کائنات سے متعلقہ اسرار و رموز کی تحقیق و تطہیر ہے۔ وہ فنکار جو اپنے اس فریضے کی خبر نہیں رکھتے وہ اپنے ضمیر کے اظہار سے قاصر رہتے ہیں۔ فنکاروں کے لئے لازمی ہے کہ وہ اولین سطح پر زندگی کے مفہوم کا تعین کریں، اس کی حدود میں انسان کے مقام کا سراغ لگائیں اور اس کے حوالے سے کائنات کی تفہیم سے عہدہ برآ ہوں۔

وہ ادب کسی طور سے کارگر نہیں جو انسان کی مستقل حالتوں ہی کا نمائندہ رہے اور تبدیلی اور عمل سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ ہمیشہ سے عمل خیز اور دنیا کو بدلنے والا ادب ہی بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اعلیٰ ادب کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں فکری یا فلسفیانہ جہت انتہائی بلند ہو۔ اس میں وحدت تأثر ہو، کسی جگہ ثنویت کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اس میں جواز یا تاویل سے کسی جھوٹ کو سچ نہ دکھایا جائے۔ اعلیٰ ادب ایسا ادب ہوتا ہے جو

انسان کو مقامی ضمیر سے بالاتر لے جاتا ہے۔ اس میں سرحدوں سے ماوراء آفاقی حقانیت کا درس ہوتا ہے۔ ادب کی یہی قسم افادی اور آفاقی ادب کہلائے جانے کی مستحق ہے اور غالباً یہی اسلامی ادب کی بھی اساس ہے کیونکہ اسلامی ادب بھی ادیب کے شعور میں وحدت خیال چاہتا ہے، اس کی توجہ کو چہار سو بکھرنے کے بجائے ایک نقطہ پر مرکوز کرتا ہے اور اسے طبقاتی ہم آہنگی، صالحیت، سچائی، خوش اخلاقی و نیک کرداری کا مرقع دیکھنا چاہتا ہے۔

ادب اور سماج دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے اثر قبول کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ صحت مند ادب کی تشکیل اسی صورت میں ممکن ہے جب سماج بھی صحت مند ہو۔ جس سماج میں مقدر اور نجوم کو بنیادی اہمیت دی جا رہی ہو، وہاں انسانی حالت یا صورت حال کا ادب تخلیق کرنا امر محال ہے۔ جہاں چیخیں پردوں کے پیچھے دبائی جا رہی ہوں۔ وہاں زندگی کے ساز کو چھیڑنے والا ساز ندہ دبکے ہوئے راگ چھیڑنے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ اپنی انگلیوں میں سرد ہوتی آگ ہی کو اپنا کل اثاثہ جان لیتا ہے۔ جہاں لوگ خوابیدہ اور نشوں میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ عیش و نشاط کی زندگی کو وطیرہ بنا چکے ہوں۔ روحانی، اخلاقی اور جسمانی وبائیں بستیوں پر شب خون مار چکی ہوں، وہاں اگر سازوں کی سریں ان کے تاروں میں یا گویوں کی آوازیں ان کے گلوں ہی مقید رہیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ ان کی رسیلی صداؤں کی جوت آگ لگانے سے قاصر رہتی ہے۔ اسے ان کے آنسو اور انفعالیتیں بجھا دیتی ہیں۔۔۔ یوں سب کی فریادیں ان کے قفس ہی میں گم ہو جاتی ہیں۔

ادب کے روح پرور اور تعمیری مقاصد کے باوجود آج کل اسے محض تخلیقی تجربہ اور فن سمجھا جانے لگا اور ادیب صرف فنکار اور اینٹرٹینر بن کر رہ گیا ہے۔ ادب کی طرف اس تحدیدی رویے سے نہ صرف تمام سماجی، اخلاقی اور ثقافتی اقدار کی نفی ظاہر ہوتی ہے بلکہ خود ادبی قدریں سوالیہ نشان بن جاتی ہیں۔ اگر ادب کو محض ایک فنی تجربہ سمجھ لیا جائے تو اس کے متون کی تمام اشکال تناظر اور سیاق و سباق سے الگ ہو کر صرف "لسانی چسکا" یا اسلوبیاتی انبساط پہ دال کریں گی، اور معنی آفرینی یا معنی خیزی کے کم و بیش تمام مباحث غیر ضروری نظر آئیں گے۔ ایسے میں اسلامی ادب کے علمبرداروں کی ذمہ داریاں مزید بڑھ جاتی ہیں تا کہ ادب کو تمام تر تعمیری رجحانات کے ساتھ زندہ رکھا جا سکے۔

● **شاکر الاکرم فلاحی**، ناگپور۔ مہاراشٹر۔ موبائیل نمبر: 9850512694

یہ موضوع ایک مستقبل تصنیف چاہتا ہے۔ ان محدود صفحات میں موضوع کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ کیا عجب کہ حیات نو کے یہ محدود صفحات ایک مستقل تصنیف کے لیے راہ ہموار کر دیں، اس امید پر چند سطور نذر قارئین ہیں۔

فنون لطیفہ مثلاً رقص و موسیقی، مجسمہ سازی اور مصوری وغیرہ پر سر دست مجھے گفتگو نہیں کرنی ہے، اس بحث کو

آئندہ کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ یوں بھی اسلام کا ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں۔ بالخصوص رقص اور مجسمہ سازی یعنی بت سازی سے۔ رہی موسیقی اور مصوری تو چند شرائط کے ساتھ ان کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اسی طرح جاندار اشیاء کی تصویر کشی بلا ضرورت ممنوع ہے۔ اگر کوئی حقیقی وتمدنی ضرورت ہے۔ تو غور کیا جا سکتا ہے۔ انہی امور میں تمثیلی فن بھی ہے یعنی حکایات وحادثات، حکمت وموعظت کی باتیں، تعلیم وتدریس کا مواد وغیرہ خواہ منظوم ہوں یا منثور مشکل کر کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نوع میں اسٹیج ڈرامہ اور ٹی وی نیوز داخل ہیں۔

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان ذرائع کی اصلاح شدہ صورت سے اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی جا سکتی ہے اور سماج کو ایک رخ دیا جا سکتا ہے۔

اب آیئے ادب کی جانب، فنی تعریف سے قطع نظر ادب کی ایک اور تعریف کی جا سکتی ہے اور وہ ہے:

''اجتماعی رویہ'' جو افراد کے باہمی تعامل کا نتیجہ ہے۔

ادب انفرادی طور پر کوئی موثر رول ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کی پشت پر اجتماعی شعور موجود نہ ہو۔ ترقی پسند ادب، جدیدیت اور مابعد جدیدیت اس کی واضح مثالیں ہیں۔

جیسا کہ میں نے ادب کو اجتماعی رویہ قرار دیا ہے، اس کو ثابت کرنے کے لیے قدرے وضاحت سے کام لینا پڑے گا۔

''ادب''، محض نثر ونظم کا نام نہیں بلکہ ایک وسیع وجامع اصطلاح ہے۔ کوئی بھی انسانی گروہ جو مشترکہ زبان وتہذیب کا حامل ہو اپنے کچھ ایٹی کیٹس رکھتا ہے۔ جس کا مظاہرہ اس مخصوص گروہ کے افراد اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں کرتے ہیں۔ ان ایٹی کیٹس کو ہم اخلاق وعادات اور اقدار وغیرہ مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اس اجتماعی رویہ کو ہم ادب کہیں گے۔

اس ادب کی تشکیل میں بنیادی کردار عقائد ونظریات کا ہوتا ہے۔ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے سے لے کر ایوان سیاست تک، حوائج ضروریہ سے لے کر عبادات تک، فکر وخیال سے لے کر اظہار وبیان تک تمام تفصیلات طے کرنے میں عقائد ونظریات بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اور مختلف آداب وجود میں آتے ہیں مثلاً معاشی ومعاشرتی آداب سیاسی وجنگی آداب وغیرہ۔ غرض جیسے نظریات ہوں گے ویسا ہی ادب تشکیل پائے گا۔ ادب اور آداب ہر چیز میں اسی کا پرتو ہوتا ہے۔

یہ اجتماعی رویہ جس قدر طاقت ور ہوتا ہے اسی قدر دوسرے انسانی گروہوں کو متاثر کرتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب ہم کوئی زبان اختیار کرتے ہیں تو اس کی تہذیب بھی اختیار کر لیتے ہیں، نیز تقریر وتحریر اور عام ذرائع ابلاغ سے پیہم اسی کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی دوسری زبان وتہذیب سے کچھ چیزیں مستعار لے لی جاتی ہیں اور پھر وہ مستقل قدر بن کر اس سماج کا حصہ بن جاتی ہیں۔ گویا زبان وتہذیب ادب کی جنم داتا ہے۔

ادب اسلامی کو ہی لیجئے۔ اسلامی عقائد ونظریات کی بنیاد پر ایک مستقل اسلامی تہذیب وجود میں آتی ہے۔

جو اخلاق وعادات اور اقدار وغیرہ کی تشکیل کرتی ہے۔ اور انفرادی واجتماعی امور میں اپنا ظہور چاہتی ہے۔

مثلاً اسلامی تہذیب میں شرم وحیا کا خاص مقام ہے۔ تو ادب اسلامی کا تقاضا یہ ہوگا کہ بے حیائی اور فحاشی کو فروغ نہ ملے۔

اسلام زندگی کو ایک خاص مقصد عطا کرتا ہے۔ ادب اسلامی کا تقاضا ہوگا کہ ایسا مشغلہ نہ اختیار کیا جائے جو اس مقصدیت کو مجروح کرے۔

اسلام اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔ ادب اسلامی کے حوالے سے یہ اعتدال دو سطحوں پر مطلوب ہے۔

ا۔فن جب تک عبادت کا حصہ ہے، مطلوب ہے۔ جب ''فن'' ہی عبادت بن جائے تو نا مطلوب ہو جاتا ہے۔

۲۔فن کا موضوع خواہ کچھ ہو اس میں اعتدال مطلوب ہے۔ حد سے زیادہ مبالغہ آرائی حقیقت اسلام کے خلاف ہے۔ ادھر اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹا، اُدھر فن کا رشتہ بھی ادب اسلامی سے ٹوٹا۔

ادب اسلامی کی مثال کے لیے یہ شعر کافی ہوگا:

گرا دیا مجھے کس نے ہوس کے قدموں پر
یہ کیسے بھول گیا میں تری نظر میں ہوں

علیٰ ہٰذا القیاس......

ادیب کی ایک بہت بڑی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ صالح اقدار وروایات سے سماج کو متعارف کرائے اور اسے فروغ دے۔ اجتماعی رویے میں جہاں غلطی پائے نشان دہی کرے، ملک وقوم کی ضروریات سے آگاہ کرے۔ مقصدیت سے خود ہٹے نہ سماج کو ہٹنے دے۔ حصول مقصد کے لیے ادیب یہ کرتا ہے کہ ذاتی تجربات ومشاہدات (علم) سے اس کا جو تأثر بنا ہے اسے نئی نسل تک منتقل کر دیتا ہے۔ اب جیسے تأثرات ہوں گے ویسے ہی اثرات پڑیں گے۔

ایک ادیب دنیا سے جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے اسے اہل دنیا کو جوں کا توں لوٹا دیتا ہے۔ اور باشعور ادیب وہ ہوتا ہے جو اپنے شعور کی چھلنی سے چھان کر صالح ادب پیش کرتا ہے۔ مثلاً:

اب بھی یہ حوصلہ ہے کچھ کام آسکوں
میں ٹوٹ تو گیا ہوں بکھرنے نہ دے مجھے

یا جیسے یہ شعر

حیات حس کی امانت تھی اس کو لوٹادی
میں آج چین سے ہوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

اس کے برعکس یہ فکر ملاحظہ کیجیے

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

گویا کہا جاسکتا ہے کہ سماج کی تعمیر میں ادب اور ادیب کا بہت اہم کردار ہوتا ہے اس کو فراموش کر کے ترقی کے زینے طے نہیں کیے جاسکتے۔

شاعری کے تعلق سے سورۃ الشعراء کی آیات 224 تا 227 سے اصل الاصول اخذ کیا جاسکتا ہے۔ اختصار کے پیش نظر صرف ترجمے پر اکتفا کرتا ہوں:

''اور شاعر کی راہ تو بے راہ رولوگ چلا کرتے ہیں کیا تم کو نہیں معلوم کہ وہ (شاعر) لوگ (خیالی مضامین کے) ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں، اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں، ہاں مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور انہوں نے (اپنے اشعار میں) کثرت سے اللہ کا ذکر کیا، اور انہوں نے بعد میں اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا ہے (اس کا) بدلہ لیا۔ (ترجمہ مولانا تھانویؒ)

مذکورہ حوالے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہاں شاعری کو نشانۂ تنقید نہیں بنایا گیا بلکہ شاعر کی طبیعت اور قول و عمل کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ اگر چہ آیات میں اشعار کا ذکر ہے مگر اس اصل کی روشنی میں جملہ اصناف ادب کو جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے۔

اس باب میں قائد اعظمؐ کا ''قول'' قول فیصل ہے:

''ان من البیان لسحرا و ان من الشعر لحکمۃ'' {بخاری مسلم۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ}

یہ حکیمانہ تبصرہ جملہ اصناف ادب کا احاطہ کر رہا ہے۔

وقل لهم فی انفسهم قولا بلیغا

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن۔

ان آیات کی رو سے فصاحت و بلاغت (جو ادب کا لازمی عنصر ہے) کی تحصیل مستحب ہی نہیں بلکہ فرض کفایہ قرار پاتی ہے۔

اس میدان میں قائد اعظمؐ نے کفار کا چیلنج بھی قبول کیا۔ آپؐ کے شاعر نے جاہلی شاعر کا اور آپؐ کے خطیب نے جاہلی خطیب کا جواب دیا، اور یہ مقابلہ دخول اسلام پر منتج ہوا، غور فرمائیے کہ اس موقع پر ''ادب'' نے اسلام کی کتنی گراں قدر خدمت انجام دی۔ اتنے ہی پر بس کرتا ہوں ورنہ شواہد تو بہت ہیں۔

مدارس اسلامیہ کا کردار کیا ہو؟

یہ ہماری بحث کا آخری اور اہم حصہ ہے کیونکہ مدارس اسلامیہ کا کردار بہت اہم ہے۔ لہٰذا ارباب مدارس ادب کی سرپرستی قبول کریں۔ موقع بموقع شعراء و ادبا کی حوصلہ افزائی کریں۔

مجھے یاد ہے جب میں جامعۃ الفلاح میں زیر تعلیم تھا۔ ''محمدؐ سب کے لیے'' ہفتہ تعارف منایا گیا تھا۔ مولانا محمد طاہر مدنی حفظہ اللہ صدر مدرس تھے۔ طلبہ و اساتذہ نے کافی جوش و خروش سے یہ ہفتہ منایا تھا۔ اس موقع پر میں

نے دونعتیں کہی تھیں۔ان میں سے ایک نعت کا مطلع یوں تھا ؎

آؤ آؤ دیپ جلائیں، دیپ جلائیں دیپ
یا پھر بن کر بادل برسیں، منہ کھولے ہے سیپ

استاذ محترم محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب نے امتحاناً اس مطلع کی تفہیم مجھ سے چاہی۔ میں نے جو کچھ عرض کیا اس سے وہ بہت خوش ہوئے، شاباشی دی۔اس سے جو مسرت مجھے حاصل ہوئی اس کے آگے دنیا کی بڑی بڑی چیزیں ہیچ ہیں۔

دوسری نعت مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے اسمبلی میں پڑھوائی۔ یہ میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا جو کسی طور میرے حافظے سے محو نہیں ہوسکتا۔اس کے علاوہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی جامعہ آمد پر جلسۂ سیرت النبیؐ میں بھی وہ نعت مولانا نے پڑھوائی اور اس کی تحسین فرمائی۔ میں ان مواقع کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

لہٰذا اگر ارباب مدارس سنجیدگی کے ساتھ ادب کی سرپرستی قبول فرمالیں، تو اس سے تحریک پا کر طلبہ واساتذہ اور فارغین ادب میں اپنی شناخت قائم کرسکتے ہیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سمت میں ادارہ جاتی کوششوں کا سراغ نہیں ملتا۔

ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ کل کے ہندوستان میں اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں صوفیاء کرام بنیاد کا پتھر ہیں۔تو پھر آج کی تاریخ میں مدارس مؤثر کردار کیوں ادا نہیں کرسکتے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ سورۂ الشعراء کی آیات جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ان سے جو اصل الاصول نکلتا ہے انتہائی اہم اور قابل غور ہے۔ جو کہ ادب اسلامی اور دیگر ادب کے درمیان حد فاصل ہے اور جو ادب اسلامی کا امتیاز بن سکتا ہے وہ یہ ہے کہ دیگر ادب میں صرف اور صرف ادب کی قدر پیمائی ہوتی ہے مگر ادب اسلامی میں ادب کے ساتھ ساتھ ادیب کی بھی قدر پیمائی کی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر آنحضورؐ نے امرؤالقیس کو جہاں ''اشعرالشعراء'' کہہ کر اس کے فن کی قدر افزائی کی وہیں ''قائد الی النار'' فرما کر ادیب کی بھی قدر پیمائی کردی۔یہی ان آیات کا ماحصل بھی ہے کہ شعراء وادباء کے قول وعمل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس تجربے سے انہیں خود بھی گزرنا چاہیے۔اعتدال و توازن جب ہی پیدا ہوگا۔کیونکہ میدان عمل سے دور رہ کر خیالی دنیا میں عمدہ سے عمدہ فلسفہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاقی نظم کوئی بھی پیش کرسکتا ہے مگر متوازن فکر اور معتدل نظام اخلاق واقدار صرف اسلامی ادیب ہی پیش کرسکتا ہے۔

بند کمرے میں اس طرح بیٹھ کر کہ بارش کی ایک بوند بھی نہ پڑے برسات کی شان میں قصیدہ کہنا غیر اسلامی طرز ہوگا جبکہ حب رسول کی بارش میں پور پور بھیگ کر نعت کہنا، ٹھیٹھ اسلامی طریقہ ہوگا۔الغرض جب بات یہ ٹھہری کہ ؎

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

تو فطری طور پر نظر مدارس اسلامیہ کی جانب ہی اٹھتی ہے۔ بجا طور پر وہ ادارے قرآن کی اس توقع کو پورا کر سکتے ہیں جو ایک طرف تو اسلامی علوم سے آراستہ ہوں دوسری طرف عمل اور اخلاق کے ہتھیاروں سے بھی لیس ہوں۔

● **محمد شریف فلاحی**، استاذ تفسیر و ادب جامعہ مصباح العلوم چوکونیاں۔ موبائیل نمبر: **9984872462**

سماج کی تعمیر و تشکیل میں ادب وفنون لطیفہ کے بے شمار اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور اسی سے اس کی اہمیت کا کماحقہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور سے دو اثرات درج ذیل ہیں: (۱) درس الفت ومحبت: مشاعروں، ادبی سیمناروں اور محفلوں میں مسلم مظاہر، ورنگ ونسل کے لوگ اپنا کلام اور مقالے پیش کرتے ہیں، جس سے سماج کے ہر طبقے و مذاہب وملل کے لوگ شریک ہو کر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف تاریخی مقامات مثلاً ایلورا، اجنتا کے غار، جامع مسجد، لال قلعہ، موتی مسجد و دیگر موسیقی کی مجالس میں مختلف مذاہب اور طبقات کے لوگ جاتے ہیں، اور وہاں پہنچ کر قدیم تاریخی مقامات اور مجلسوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ (۲) درس اتحاد واتفاق: مشاعروں اور ادبی محفلوں میں ہر طبقے کی شرکت اور تاریخی مقامات میں مختلف طبقات کے ورود سے ایک طرح کا رواداری اور اتحاد واتفاق کا درس ملتا ہے۔

علاوہ ازیں سماج کی تعمیر و تشکیل میں ادب وفنون لطیفہ کی اہمیت اس طرح مزید واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے ذریعے سے ملک کے بے شمار لوگوں کو روزگار ملتا ہے، اور ماہرین علم نفسیات مسلم ذہنی امراض کا علاج کرتے ہیں۔

اسلام ادب اور فنون لطیفہ کے تعلق سے یہ اصولی ہدایت پیش کرتا ہے کہ جس ادب وفن سے پاکیزہ فطرت کے بنیادی اصول مجروح نہ ہوں اور جو ادب وفن انسانوں کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل و پاسدار بنائے وہ نہ صرف یہ کہ درست ہے، بلکہ مستحسن ہے۔ اور جو ادب وفن انسانوں کے درمیان صالح جذبات واحساسات کو فروغ نہ دے اسلامی ادب اس کی پرزور مذمت کرتا ہے۔

جو ادب متعین نصب العین رکھے، اور اسلامی تہذیب وثقافت اور اوصاف وخصائل، احکام وفرامین کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام پر وارد ہونے والے شبہات والزامات کا رد کرتا ہے، اسے اسلامی ادب کہتے ہیں۔

اسلامی ادب سے ہماری مراد وہ ادب ہے، جس میں اس بات کی کوشش کی جائے کہ علمی وعقلی دلائل سے لوگ اسلام سے مطمئن ہوں، مزید یہ کہ مطمئن ہونے والوں کو اسلام پر جمے رہنے پر آمادہ کیا جائے، جس کو بالفاظ دیگر تأثراتی وحرکی اسلامی ادب بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ادیب اپنے اشعار میں جب کسی کی ہجو کرتا

ہے، تو بدگوئی اور گندہ ذہنی میں مبتلا نہیں ہوتا ہے اور جب کسی کی تعریف کرتا ہے تو قصیدہ گوئی پر اتر کر ممدوح کو معبود نہیں بناتا ہے، اور اپنے کذب وافتراء ومبالغہ سے احتراز کرتے ہوئے اپنے افسانے میں زندگی کی سچی اور حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔ اور صحافت میں واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے بجائے بلا کم وکاست پیش کرتا ہے۔

ادب اسلامی کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا کردار بہت ہی واضح اور نمایاں رہا ہے، تحریک آزادی ہند کے بعد ہی سے منظم طور سے ملک بھارت میں جتنے بھی مدارس وجامعات اور مکاتب کھلے ہیں ان میں اسلامی ادب کو نہ صرف سرفہرست رکھا گیا ہے، بلکہ بعض مدارس میں صرف اسلامی ادب ہی کو جگہ دی گئی ہے۔

مدارس اسلامیہ ادب اسلامی بالخصوص اردو ادب کے تعلق سے درج ذیل کردار ادا کرسکتا ہے:

(۱) اردو زبان میں نصاب تعلیم میں مطلوبہ مقام دے کر۔ (۲) حسب استطاعت ووسعت اردو رسائل وجرائد کا اجراء کرا کر۔ (۳) اخبارات ورسائل میں مضامین اور مقالات کی اشاعت۔ (۴) صحیح اسلامی فکر کے حامل افسانے، انشائیے، مکالمے، کہانیاں، ڈرامے وغیرہ کی اشاعت۔ (۵) اردو تقریر، مضمون نویسی، اور بیت بازی وغیرہ کے مقابلے کا انعقاد۔ (۶) شعبہ نشر واشاعت کے تحت اردو کتب کی اشاعت وترویج کا کام۔ (۷) مدارس کا ذریعہ تعلیم اردو زبان بنا کر۔

● **اسامہ شعیب فلاحی**، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔ ای میل:
usama9911@gmail.com

ادب عربی زبان کا لفظ ہے اور مختلف النوع مفہوم کا حامل ہے۔ ظہورِ اسلام سے قبل عربی زبان میں ضیافت اور مہمانی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ بعد میں ایک اور مفہوم بھی شامل ہوا جسے ہم مجموعی لحاظ سے شائستگی کہہ سکتے ہیں۔ عربوں کے نزدیک مہمان نوازی لازمہ شرافت سمجھی جاتی ہے، چنانچہ شائستگی، سلیقہ اور حسن سلوک بھی ادب کے معنوں میں داخل ہوئے۔ اسلام سے قبل خوش بیانی کو اعلیٰ ادب کہا جاتا تھا۔ گھلاوٹ، گداز، نرمی اور شائستگی یہ سب چیزیں ادب کا جزو بن گئیں۔ (وکی پیڈیا، زمرہ 'ادب')

کارڈ ڈینل نیومین کے مطابق: ''انسانی افکار، خیالات اور احساسات کا اظہار زبان اور الفاظ کے ذریعے ادب کہلاتا ہے''۔ (وکی پیڈیا، زمرہ 'ادب')

نارمن جودک کہتا ہے: ''ادب مراد ہے اس تمام سرمایہ خیالات واحساسات سے جو تحریر میں آچکا ہے اور جسے اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو مسرت حاصل ہوتی ہے''۔ (وکی پیڈیا، زمرہ 'ادب')

سید عابد علی عابد لکھتے ہیں: ''وہ تمام تحریریں ادب کے دائرے میں داخل سمجھی جائیں گی جن کے مطالب کو ذوق سلیم معیاری تصور کرے گا اور جن کا اسلوب نگارش صناعانہ اور فنکارانہ ہوگا کہ حسن صنعت یا فن کی صنعت لازم ہے''۔ (اصول انتقاد ادبیات 1960ء: ص29 بحوالہ ادبیات مودودی)

یہ بات طے شدہ ہے کہ ادب ادیب کے ضمیر کی آواز اور اس کے عقیدہ وفکر کا ترجمان ہوتا ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ ادب فکر کا ترجمان ہو۔ایسا نہ ہو کہ اس کی فکر اسلامی ہو مگر ادب فکر غیر اسلامی ۔وہ خود تو اعلی اسلامی اخلاق کا پیکر ہو لیکن اس کی نثر و نظم غیر اسلامی اخلاق کی ترجمانی کر رہی ہو۔فکر و عمل اور اظہار کا یہ تضاد اسلامی، اخلاقی اور ادبی کسی بھی حوالہ سے مستحسن نہیں سمجھا جاسکتا۔چنانچہ اسلامی ادب سے مراد وہ ادب لیا جاتا ہے جو اسلامی اقدار کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہو،انسانوں کو بھلائی کی طرف لے جانے والا ہو اور اخلاقِ حسنہ و اتحاد کی دعوت دینے والا ہو،خواہ وہ نثر کی شکل میں ہو یا نظم،اشعار،صحافت،خطابت اور مترجم کی صورت میں ہو۔ اس میں توحید،رسالت،آخرت اور معروف ومنکر وغیرہ کے تمام موضوعات شامل ہیں۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ادب کا مقصد صرف تفریح طبع اور تسکینِ نفس ہے جسے اصطلاحاً 'ادب برائے ادب' یا 'ادب برائے تفریح' کا نام دیا جاتا ہے۔ایسا تو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو انسان کے وجود ہی کو بے مقصد سمجھتے ہیں تو وہ بھلا ادب کو کیسے کسی مقصد کے تابع کر سکتے ہیں۔لیکن ایک مومن یہ تسلیم کرتا ہے کہ انسان کا مقصد اس دنیا میں اللہ کی رضا کی طلب اور اس کے دین کی سرفرازی ہے اور وہ اسی کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ لہذا اس کا ہر عمل اس عظیم مقصد کے مطابق ہونا چاہیے۔اسلام تفریح کے خلاف نہیں ،لیکن یہ تفریح اسلام کے خلاف جا کر نہیں ہوسکتی۔اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ زندگی کے ہر مسئلہ میں اسلام سے رہنمائی حاصل کرے خواہ وہ تجارت اور سیاست کے شعبے ہوں یا آرٹ اور فنون لطیفہ کی شاخیں۔خاص کر فنون لطیفہ کے سلسلہ میں آج یہ تصور عام ہے کہ ان کا اسلام سے کیا تعلق؟انھیں تو بہر صورت آزاد ہونا چاہئے،لہذا آج یہ حیوانیت اور انسانیت سوز حرکات کے پھیلانے کا موثر ترین ذریعہ بنالیا گیا ہے۔اس کو روکنے کی ضرورت ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں نے اسلام میں علم کے غیر معمولی تصور کی وجہ سے اس پر شروع ہی سے خصوصی توجہ دی۔ ہر دور میں کثیر تعداد میں مدارس قائم کیے گئے۔جہاں دینی اور عصری دونوں طرح کی تعلیم دی جاتی رہی۔یہاں کے فارغین عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے ادیب،شاعر اور سیاسی و سماجی رہ نما ہوا کرتے تھے۔اسلامی ادب میں نثر نگاری ہو یا شعر گوئی،ناول و افسانہ نگاری اور انشاء پردازی ہو،ان سب میں فارغینِ مدارس نے طبع آزمائی کی اور اسلامی ادب کو بامِ عروج پر پہنچایا۔

● **عبدالحمید حاکم (فلاحی)** ، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔نئی دہلی،موبائیل نمبر:
9891677982

ادب درحقیقت فنون لطیفہ میں ایک اہم ترین فن لطیف شمار ہوتا ہے اس کی تخلیق میں جہاں انسان کے فکر وخیال کا دخل ہوتا ہے، وہیں احساسات وجذبات کا بھی خاصا اہم رول ہوتا ہے کیونکہ انسان محض سوچنے سمجھنے کی کوئی مشین نہیں بلکہ اس کے اندر تدبر و تفکر کے کمالات بھی ہیں اور احساسات و تأثرات جیسی خوبصورت اور لطیف کیفیات کی رنگینیاں بھی،لہٰذا ازل سے ادب انسانی زندگی کا ایک لازمی عنصر اور جزو لاینفک رہا ہے اور یہ

بات بجا طور پر کہی جاتی رہی ہے کہ ادب اور انسانی زندگی میں جسم و جاں کا سا تعلق ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ادب کو زندگی سے جدا کر دیا جائے تو اس حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ اذیت کی تصویر بن جائے، کیف و سرور کی ساری سرمستیاں کافور ہو جائیں، الفت و محبت کے جام شیریں چٹخنے لگیں اور زندگی بے رنگ و بو بن کر رہ جائے، ادب اور زندگی کا یہی وہ اٹوٹ رشتہ ہے کہ ایک ادیب جب بھی اپنے اشہب قلم کو مہمیز کرتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز، مسائل اور چیلنجز، جذبات اور احساسات ہی کو اپنا موضوع سخن بناتا ہے اس لیے کہ وہ بجا طور پر اپنے گرد و پیش کے حالات سے متأثر ہوتا ہے، اور جن چیزوں کا وہ صبح و شام اپنے سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے، وہی کچھ اس کی تحریر اور تخلیق میں فکر و خیال کی وادیوں سے ہو کر الفاظ و تعبیرات کے قالب میں صفحۂ قرطاس پر عیاں ہوتا ہے، پھر حقیقی ادب بھی وہی ہے جو تصنعات کی ثقالت سے گراں بار نہ ہو کر حقائق کی صحیح منظر کشی کرے۔ کیونکہ ایک ادیب کسی بھی سماج اور سوسائٹی کا انتہائی حساس عنصر ہوا کرتا ہے، وہ وہی کچھ بیان کرتا ہے جو حقیقی دنیا میں وقوع پذیر ہو رہا ہو، وہ اپنی اسی حساسیت کی بنا پر سماج میں جہاں کہیں بھی اخلاقی اقدار کا فقدان، سماجی روایات اور معاشرتی آداب میں کسی بھی قسم کا سقم اور انفرادی و اجتماعی معاملات میں حسن و جمال کو مفقود پاتا ہے تو اضطراب اور بے چینی کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے اور پھر یہی احساس و اضطراب حقیقی ادب کو جنم دیتا ہے اور چونکہ اس کی یہ تخلیق اس کے اندرون کا حسین مظہر ہوتی ہے لہٰذا یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ اس کے احساسات اور وجدان و خیال کی پرواز کتنی بلند اور اس کے فکر و خیال کتنے بے لوث اور بے آمیز ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ادب تو اسی وقت ادب کہلاتا ہے جب کہ وہ داخل کا بے لوث ترجمان اور ضمیر کا بے باک اظہار ہو۔ اس مقام پر پہنچ کر شاید اب یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ادب پوری انسانی زندگی پر محیط ہے، زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ادب سے مستغنی نہیں ہے لہٰذا ہر دور میں ادب اور زندگی کے تعلق پر لب کشائی اور خامہ فرسائی ہوتی رہی ہے اور بڑے بڑے نشیب و فراز بھی آتے رہے ہیں، مختلف عناصر نے سر اٹھائے ہیں اور دانستہ و غیر دانستہ طور پر اس کے وجود میں تصرفات بھی کیے ہیں، لہٰذا ایک وقت وہ بھی آیا جب ''ترقی پسند تحریک'' اور ''جدیدیت'' کی تحریک نے اس چشمۂ شیریں کو اپنے مذموم افکار و نظریات سے گدلا کرنے کی کوشش کی، وہیں ''جدیدیت'' نے ادب کی فنی اساس پر ہی شب خوں مارا، نتیجتاً دنیائے ادب میں ایک قسم کی افراتفری اور برہمی کی فضا بن گئی۔ لہٰذا یہ وہ حالات تھے جب ''ادب اسلامی'' کے نام سے کسی تحریک کو ابھرنے کا موقع ہاتھ آیا اور پھر تقسیم ہند کے ساتھ ہی یہ تحریک پروان چڑھنے لگی، لیکن برا ہوا اُن ناقدین کا کہ جنہوں نے ابتدا ہی سے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا، اور ستم تو جب ہوا کہ خود وہ لوگ بھی جو ادب کو کسی نظریہ، تحریک اور نظام زندگی سے وابستہ کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ادب کے لیے کسی نظریئے کا وجود از حد ضروری ہے وہ بھی اس اکھاڑے میں کود پڑے، تاہم یہ سوال باقی ہے کہ اس تحریک کو آگے بڑھانے کی ضرورت کیوں کر پیش آئی، دراصل واقعہ یہ ہے کہ ''ترقی پسند تحریک'' اور ''جدیدیت'' نے اردو ادب میں وہ بے اعتدالیاں اور عدم توازن پیدا کر دیا تھا کہ اس توازن اور اعتدال کی

بازیافت اس قسم کی تحریک کے بغیر ممکن نہیں تھی لہٰذا اس پس منظر کے ساتھ اس تحریک کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس نام سے تحریک کے آغاز کی غرض و غایت یا علت وسبب یہ تھا کہ ادب اور مذہب کے مابین جو رشتہ ہے وہ دوسرے کسی بھی نظریئے اور ادب کے درمیان نہیں ہے، اور وہ نظریہ اسلام کا آفاقی اور عالم گیر نظریہ ہے، اس لیے کہ ادب اور مذہب کے باہمی رشتے کا جامع و مانع تصور صرف اور صرف اسلام میں ہی پایا جاتا ہے، ورنہ دیگر مذاہب تو محض عبادتی رسوم اور چند اخلاقی تعلیمات تک ہی محدود ہیں، ان کے پاس نہ کوئی جامع نظریۂ حیات ہے اور نہ ہی کوئی محکم اور مضبوط نظام زندگی، اسی وجہ سے اسلامی ادب کے آغاز اور ترویج کی اشد ضرورت تھی کہ مختلف گمراہ کن افکار ونظریات جو ادب کے وجود پر سوالیہ نشان لگا رہے ان کا قلع قمع کسی مضبوط اور محکم نظریئے ہی سے ممکن تھا، لہٰذا اب یہ بحث ختم ہو جانی چاہئے کہ ''اسلامی ادب'' کی اصطلاح ایک بے معنی سی شئے ہے، اس لیے کہ اسلامی ادب کی نسبت اسلام سے ہونے پر اس میں آفاقیت اور وسعت ظرفی پیدا ہوتی ہے، وہ پھر تنگ نظری اور کوتاہ بینی کی تاریک گلیوں سے نکل کر کشادہ ظرفی اور وسعت نظری کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور یہیں سے وہ انتہائی اعلیٰ اخلاقی اقدار سے بھی روشناس ہوتا ہے، اور یہیں سے اسے مقصدیت کا شعور اور ادراک بھی ہوتا ہے کیونکہ اسلام فن یا ادب کو صحیح سمت سفر اور عظیم مقصد عطا کرتا ہے، اس کا پیغام ازل سے یہی رہا ہے کہ حیات انسانی کی تعمیر نو، اس کی تطہیر اور تشکیل جدید کا مشن اور کام ہر آن جاری وساری رہنا چاہیے۔

یہاں یہ پہلو بھی نظر انداز نہ ہونے پائے کہ ہمیں جملہ امور و معاملات میں اعتدال کو پیش نظر رکھنا چاہئے وہ اس طور سے کہ ہمارا سارا زور بازو محض اصطلاح پسندی پر صرف نہ ہو کہ اصل شئے جو محمود اور پسندیدہ ہے وہ اسلامی زندگی ہے، اس لیے کہ اگر زندگی صحیح اسلامی نہج پر ہوگی تو ادیب کی ہر تخلیق اور ہر تحریر خالص اسلامی ہوگی اسے یہ اعلان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں پیش آئے گی کہ اس کی فلاں اور فلاں تخلیق اسلامی ہے یا نہیں، مثال کے طور پر ہم اقبالؒ کی شاعری کو دیکھیں، کہاں اور کب انہوں نے یہ کہا کہ میری فلاں اور فلاں تخلیق ''اسلامی ادب'' کا شاہکار ہے اور فلاں نہیں، بلکہ چونکہ ان کی پوری زندگی قرآن کریم کے سائے میں گزری اور ان کے فکر ونظر کی اساس اور منہاج خالص اسلامی تھا، لہٰذا ان کی شاعری کو ''اسلامی'' اور ''الہامی'' شاعری تک کہا گیا۔

بہر کیف اس بحث کے بعد یہ سوال ابھی باقی رہتا ہے کہ اہل مدارس اس ضمن میں کیا رول ادا کر سکتے ہیں ادب اسلامی کی ترویج و ترقی میں ان سے کس حد تک امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں تو یہ بات بغیر کسی ادنیٰ تأمل کے کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی ادب کی صحیح معنوں میں اگر کوئی خدمت کر سکتا ہے تو وہ اہل مدارس ہی ہیں، کیونکہ ادب کا موضوع انسان اور اس کے متعلقات ہیں، اور ایک خوبصورت تخلیق کے لیے جو حسن و جمال، فکر و خیال، تدبر و تفکر اور خاموش ریاض درکار ہوتا ہے، وہ قرآن کریم کو اپنے فکر ونظر کا مرکز و محور بنانے والوں کو بدقت چند حاصل ہوسکتا ہے، کتنے خوبصورت اور دلنشیں انداز میں وہ فطری حسن و جمال کا نقشہ کھینچتا ہے، اشجار و انہار کی منظر کشی ہو یا پہاڑوں اور وادیوں کی معجز بیانی آفاق و انفس کا بیان ہو یا صحراؤں اور مرغ زاروں کی تصویر کشی، تدبر و

تفکر کی دعوت ہو یا فکر مسلسل کی مہمیز، یہی وہ صفات اور فنی محاسن ہیں جن کا التزام کر کے ایک ادیب اپنی تخلیق کو ثریا کی بلندیوں سے ہمکنار کر سکتا ہے کیونکہ ایک ادیب کی جمالیاتی حس جتنی تیز اور پروازِ تخیل جتنی بلند ہوتی ہے اس کی تحریر و تخلیق اتنی جلد شہرت کے بام عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

لہٰذا جب اہل مدارس شب و روز قرآنی فضا میں بسر کرتے ہیں، اس کے معانی و مطالب پر غور و فکر اور اس کے ادبی و فنی، اخلاقی اور جمالیاتی اسالیب سے حظ اٹھاتے ہیں، اس کے لغوی اور لسانی پہلوؤں پر مباحثے کرتے ہیں تو بجا طور پر انہی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک صالح اور مفید ''ادب اسلامی'' کی ترقی و ترویج میں غیر معمولی کردار ادا کریں گے خصوصاً وہ مدارس جن کے نصاب تعلیم کا مزاج و منہاج ہی قرآنی ہے، انہیں تو لازماً اس کوچہ میں قدم رکھنا چاہئے اور اپنا واجبی کردار ادا کرنا چاہئے۔

● **زهیر احمد فلاحی**، ایم اے سال آخر، شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، موبائیل نمبر: **9045481070**

سماج اور ادب کا باہم تعلق چولی اور دامن کا ہے، ایک کو دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، ہر ادب اپنے سماج کا عکاس اور ہر ادیب اپنی سوسائٹی کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ چونکہ ادب نام ہے احساسات و جذبات کو حسین پیرائے میں ڈھالنے کا اور بقول مولانا مودودیؒ ''حسن کلام اور تاثیر کلام'' کا، لہٰذا اس کا براہ راست اثر انسان کے خیالات اور اس کے احساسات و جذبات پر ہوتا ہے۔ کسی بھی سماج کو مثبت رخ دینے یا اس کو منفی مشغولیات میں الجھانے میں ادب کا خاصا کردار ہوا کرتا ہے۔ ادب انسانی زندگی کا حسین ترجمان اور اس کے افکار کا پرتو ہوتا ہے، ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے، زندگی کی ترجمانی کرتا ہے، اور زندگی ہی کے کام آتا ہے، اور ہمیشہ معاشرے اور زندگی کی تعمیر یا تخریب میں مشغول رہتا ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ کسی معاشرے کا ادیب اپنے آپ کو معاشرے سے خارج کر کے کوئی اور ہی ادب پیش کرے یا جو کچھ وہ پیش کر رہا ہو وہ دوسروں پر اثر انداز نہ ہو۔ مغربی لادینی افکار و نظریات کے حوالے سے ادب نے معاشرے کو جس پیکر میں ڈھالا اسی کا ساختشانہ ہے کہ معاشرہ جس بحران، انتشار، ناآسودگی، روحانی کرب، اخلاقی انارکی، جنسی بے راہ روی، قتل و غارت گری، معاشی استحصال، معاشرتی نابرابری اور تہذیبی شکست وریخت سے دوچار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادب انسانی خیالات، جذبات اور اقدار کو زندہ رکھنے اور بنانے بگاڑنے والی عظیم طاقت ہے۔

دین اسلام، دین رحمت ہے انسانیت کے لیے، یہ ہر اس چیز کا مداح ہے جس سے انسانیت کو ضرر نہ پہنچے۔ اسلام نے اس ادب کی پذیرائی کی ہے جو انسانیت کے لیے نافع بن کر ابھرے جب اللہ کے رسولؐ مبعوث کیے گئے تو آپ نے جاہلی ادب کو قرآنی ادب کے مقابلے میں دعوت مبارزت دی، تو عرب کا کوئی بھی ادیب اسے

قبول نہ کر سکا، اگر کسی نے جرأت بھی کی تو منھ کی کھائی۔ اسلام نے ادب کی طاقت کو آسمانی کتابوں میں استعمال کیا ہے اور اسے معرکہ خیر وشر میں استعمال کرنے کی ہدایت بھی کی ہے، نبیؐ کا عمل اس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ آپؐ افصح العرب تھے، حضورؐ کے کلام کا جہاں ادبی معیار بہت بلند تھا وہاں اس میں سادگی بھی تھی آپؐ کا اپنے بارے میں خود ارشاد ہے: ''میں فصیح ترین عرب ہوں، میں کلمات جامع لے کر مبعوث ہوا ہوں۔'' اس کے علاوہ آپؐ کے خطوط جو آپ نے قبائل کے سردار، علاقائی افسروں اور مذہبی پیشواؤں کے نام جاری کیے سب بلاشبہہ ادب وفن کے شاہکار ہیں۔

آپؐ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ''جنھوں نے خدا اور رسول کی مدد تلواروں سے کی ہے آخر وہ شعر وادب سے اس مقصد خاص کی اشاعت کیوں نہیں کرتے''۔ حضرت حسان بن ثابتؓ، کعب بن زہیر اور نابغہ اسی ضرورت کی پیداوار تھے۔

ادب اسلامی نام ہے ایک نظریہ کا، ایک مخصوص فکر کا، ایک خاص ذہنیت کا، جس کی جڑیں زمیں کی اتھاہ گہرائیوں میں پیوست ہیں اور جن کی بلندی اور وسعت آسمان کی بلندی سے ہم کلام ہے۔

اسلامی ادب کا نظریہ ہر ملک، ہر عہد اور ہر زبان کے ادب میں ایک توانا فکر رہا ہے اس کی توانائی اور ثبات قدمی کا راز یہ ہے کہ اس کی فکری بنیاد توحید، رسالت اور آخرت متعین، معلوم اور غیر متزلزل ہیں۔ اس نظریے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پاس زندگی، کائنات اور انسان کے تمام سوالات کے جوابات موجود ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق کائنات کوئی بازیچۂ اطفال نہیں، بلکہ کارگاہ حکیم ہے۔ انسان اس کے یہاں کوئی مادہ کی پیداوار نہیں، بلکہ اشرف المخلوقات ہے۔ حیات کا مقصد اس کے یہاں یہ ہے کہ وہ ان تمام اچھائیوں سے اپنے آپ کو آراستہ کرے جو اس کے خالق کو مطلوب ہیں۔ یہی وہ بنیادی نکات ہیں جن پر ادب اسلامی کا قلعہ تعمیر ہوتا ہے۔

مدارس اسلامیہ بلاشبہہ فروغ ادب اسلامی کے لیے ایک مضبوط ذریعے کی حیثیت رکھتے ہیں، میرے ناقص فہم اور ناکافی مطالعہ کے مطابق مدارس اسلامیہ کما حقہ اپنا فریضہ نہیں انجام دے رہے ہیں، اسلامی ادب کو ایک مضمون کی حیثیت سے صرف پڑھا دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ادب اسلامی کے فروغ کے لیے مدارس اسلامیہ کو اس سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی ضرورت ہے۔

دعوت دین امت مسلمہ کا فریضۂ منصبی ہے، اگر وسیع پیمانے پر سوچا جائے تو دعوت دین کے ذرائع ووسائل زمان ومکان کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، آج کا دور ایک علمی سیلاب کا دور ہے، ہر نظریہ کے لیے اس کا اپنا ایک ادب (لٹریچر) ہے، ہر ذہنیت کی ایک مضبوط بنیاد ہے جس کے بل بوتے وہ پھل پھول رہی ہے۔ دین اسلام جس کے پاس ایک ہمہ گیر نظام اور ایک آفاقی پیغام ہے ضرورت ہے کہ اس کی تبلیغ واشاعت کے لیے ذرائع کا سہارا لیا جائے، ادب کی طاقت کو دنیا نے تسلیم کیا ہے آج ضرورت ہے اس بات کی کہ اہل مدارس اور

فارغین مدارس اس کے ذریعے اسلام کی آفاقی تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔اور بقول مولانا مودودیؒ:

''ہر شخص کو اپنے آپ کو ٹٹول کر دیکھنا چاہیے جو ادب کے جس شعبہ کے لیے موزوں ہیں وہ اپنے آپ کو اسی کے لیے تیار کریں، جو خطابت کی صلاحیت پاتے ہوں وہ اپنے آپ کو اسی کے لیے تیار کریں تاکہ ان کی یہ قوت ناطقہ اور قوتِ کلام خدا کے کام میں آئے، جن کے اندر لکھنے کی صلاحیت ہو تو وہ اپنا جائزہ لیں کہ وہ کس نوعیت کے کام کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔صحافت، افسانہ نویسی جیسی چیز کے لیے اپنے آپ کو موزوں پائیں تو اسی کے لیے نفس کی تربیت کریں اور جو لوگ بہتر علمی اور دماغی صلاحیت رکھتے ہوں وہ علم کے مختلف شعبوں میں آگے قدم بڑھائیں... میں خاص طور پر اپنے نوجوانوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اس جمود کو ختم کریں اور ادب کے ہر شعبے میں آگے بڑھیں، مجھے توقع ہے کہ میری یہ اپیل بہرے کانوں سے نہ سنی جائے گی اور رفتہ رفتہ ادب کے محاذ کی طرف ہمارے نوجوان کثرت سے متوجہ ہو جائیں۔'' وما التوفيق الا بالله العلي العظيم

فارغین جامعہ متوجہ ہوں

۱) اِس ماہ سے حیات نو میں ایک نیا کالم '**بزم ادب**' کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔اس کالم میں فلاحی برادران کی شعری ونثری تخلیقات کی اشاعت پیش نظر ہے۔فلاحی برادران سے گزارش ہے کہ اپنی نظم وغزل کے علاوہ افسانہ، کہانی، انشائیہ، مختصر ناول وغیرہ بھی ارسال فرمائیں۔

۲) حیات نو میں تعارف وتبصرے کے کالم میں کوشش ہے کہ فلاحی برادران کی کاوشوں کو ترجیح دی جائے، تاہم اس کے لیے گزارش ہے کہ اپنی تصنیف، تالیف، ترتیب، یا ترجمہ کردہ کتابوں کی ۲/۲ کاپیاں ارسال فرمادیں۔

۳) حیات نو کا ایک مستقل کالم اخبار انجمن ہے، اس کالم میں مرکزی انجمن کے علاوہ مختلف یونٹس کی خبروں کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ذمہ داران یونٹس اس بات کا اہتمام کریں کہ جب بھی یونٹ میں کوئی ایسی سرگرمی عمل میں آئے، یا یونٹ کے کسی فلاحی بھائی سے متعلق کوئی ایسی خبر ہو جسے فلاحی برادران تک پہنچنا مناسب معلوم ہو تو اسے لازماً مدیر کے نام ارسال فرمادیا کریں۔

کچھ آئندہ شمارے کے بارے میں

(۱) آئندہ شمارے کے لیے خصوصی کالم کا موضوع ''**کار دعوت کے لیے فارغین مدارس کی تیاری**''متعین کیا گیا ہے۔

(۲) اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اہل فکر ونظر اپنے افکار وخیالات اس طرح ارسال کریں کہ ۱۵/ **نومبر** تک ہمیں لازماً موصول ہو جائیں۔

(۳) کوشش رہے کہ تحریر جامع اور مختصر ہو، اور حیات نو کے ۲/ **صفحات** سے زیادہ طویل نہ ہو۔

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۵)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ہیڈ آف ریسرچ دارالشریعہ متحدہ عرب امارات

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر رہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

(ا) تبینت الجن کا مطلب

تبین کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کا واضح ہوجانا، جو چیز واضح ہوتی ہے وہ تبین فعل کا فاعل بنتی ہے، اور جس شخص پر وہ چیز واضح ہوتی ہے اس کے لئے لام کا صلہ آتا ہے۔

جیسے:

وَكُلُواْ وَاشْرَبُواْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔ (البقرۃ:۱۸۷)

''اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری (شب کی) سیاہ دھاری سے تمہارے لئے نمایاں ہوجائے''۔(امین احسن اصلاحی)

قرآن مجید میں تبین زیادہ تر لام کے صلہ کے ساتھ آیا ہے، جو اس پر داخل ہوتا ہے جس پر کوئی بات واضح ہوجائے۔جبکہ ذیل کی آیت میں وہ لام کے صلہ کے بغیر آیا ہے:

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَى مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ۔(سبا:۱۴)

اس آیت میں تَبَيَّنَتِ الْجِنّ کے ترجمہ میں عام طور سے مترجمین قرآن نے جو مفہوم اختیار کیا ہے وہ زبان کے قواعد سے میل نہیں کھاتا، چند ترجمے بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں:

''پس جب ہم نے اس پر موت کا فیصلہ نافذ کیا تو ان کو اس کی موت سے آگاہ نہیں کیا مگر زمین کے کیڑے نے جو اس کے عصا کو کھاتا تھا۔پس جب وہ گر پڑا تب جنوں پر واضح ہوا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں نہ پڑے رہتے۔''(امین احسن اصلاحی)

''اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے''۔(سید مودودی)

''سو جب وہ گر پڑے تب جنات کو حقیقت معلوم ہوئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کی مصیبت میں نہ رہتے''۔(اشرف علی تھانوی)

اگر آیت میں تبین للجن ہوتا تب تو مذکورہ ترجمے یقیناً درست ہوتے، لیکن تَبَيَّنَتِ الْجِنّ کا مطلب تو خود جنوں کا واضح ہونا، اور ان کی حقیقت کا سامنے آجانا ہے نہ کہ جنوں پر کچھ واضح ہونا ہے۔جیسے قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ (البقرة:۲۵۶) کا مطلب یہ ہے کہ صحیح بات واضح ہوگئی۔

گو کہ بعض مفسرین کے مطابق تبین علم کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس کی تائید میں کلام عرب سے ایک شعر بھی مثال میں پیش کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہو ابوحیان کی تفسیر البحر المحیط۔لیکن یہ مشہور استعمال نہیں ہے، قرآن مجید میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، اس کے علاوہ اگر ان مفسرین کی بات مان بھی لی جائے تو بھی آیت کا جو مفہوم سامنے آتا ہے وہ اشکال سے خالی نہیں ہے۔کیونکہ مطلب یہ سامنے آتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے گرنے سے جنوں پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ وہ غیب کا علم نہیں رکھتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جن تو اپنے بارے میں جانتے ہی ہیں کہ وہ غیب نہیں جانتے، جس طرح ہر انسان اپنے بارے میں جانتا ہے کہ وہ غیب نہیں جانتا۔اصلاح کی ضرورت تو ان لوگوں کو تھی جنہوں نے جنوں کے بارے میں یہ غلط مفروضہ قائم کر رکھا تھا کہ وہ غیب جانتے ہیں، چنانچہ اس واقعہ کے بعد جنوں کے بارے میں یہ حقیقت سب پر واضح ہوگئی کہ وہ غیب نہیں جانتے ہیں۔

حقیقت واقعہ اور عربی کے قواعد دونوں کی رو سے صحیح ترجمہ اس طرح ہوگا:

''پھر جب سلیمان زمین پر آیا جنوں کی حقیقت کھل گئی اگر غیب جانتے ہوتے تو اس خواری کے عذاب میں نہ ہوتے'' (احمد رضا خان)

''پس جب وہ گر پڑا تب جنوں کی حقیقت واضح ہوگئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں نہ پڑے رہتے'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۲) فعل مضارع کے زمانہ کے تعین کا مسئلہ

فعل مضارع چونکہ حال اور مستقبل دونوں کے لئے آتا ہے، اور بسا اوقات دونوں میں سے کسی ایک کو متعین کرنے کے لئے درکار قرینہ بھی واضح طور سے موجود نہیں ہوتا، ایسے میں زمانہ متعین کرنے میں دشواری ہوتی ہے، حسب ذیل مثال سے اس دشواری کو سمجھا جا سکتا ہے:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِيْ أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ۔ (النمل:۸۸)

اس آیت کے پہلے حصے میں تین باتیں ہیں، پہاڑوں کو دیکھنا، پہاڑوں کو جما ہوا سمجھنا، پہاڑوں کا بادلوں کی طرح اڑنا۔

بعض ترجموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تینوں باتیں زمانہ مستقبل یعنی روز قیامت کی ہیں، جیسے:

''اور تو دیکھے گا پہاڑوں کو خیال کرے گا کہ وہ جمے ہوئے ہیں اور وہ چلتے ہوں گے بادل کی چال یہ کام ہے اللہ کا جس نے حکمت سے بنائی ہر چیز، بیشک اسے خبر ہے تمہارے کاموں کی''۔ (احمد رضا خان)

''اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرو گے کہ وہ ٹکے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے''۔ (امین احسن اصلاحی)

یہ ترجمے کمزوری سے خالی نہیں ہیں، کیونکہ آخرت میں پہاڑ کو دیکھ کر یہ گمان کرنا کہ وہ جمے ہوئے ہیں جبکہ وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں، تکلف سے بھرپور بات ہے کیوں کہ جب وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے تو انہیں جما ہوا سمجھنے کی کیا وجہ ہوگی۔

بعض ترجموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اول دو باتیں زمانہ حال کی ہیں جبکہ آخری بات زمانہ مستقبل یعنی قیامت کی ہے، جیسے:

''آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں، مگر اُس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے، یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہوگا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو''۔ (سید مودودی)

''اور تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو خیال کرتے ہو کہ (اپنی جگہ پر) کھڑے ہیں مگر وہ (اس روز) اس طرح اُڑے پھریں گے جیسے بادل (یہ) خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا، بیشک وہ تمہارے سب

افعال سے باخبر ہے''۔(فتح محمد جالندھری)

ان ترجموں میں سیاق کلام کا لحاظ نہیں رکھا گیا، سیاق کلام کا تقاضا یہ ہے کہ وَتَرَى الْجِبَالَ کو آخرت کی بات مانا جائے کیوں کہ گزشتہ آیت میں آخرت کا بیان ہے، مزید یہ کہ وَتَرَى الْجِبَالَ کا حال اگر وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ہے اور وہ مستقبل سے متعلق ہے تو دونوں کو ایک ہی زمانہ کا ہونا چاہئے، یہ واو حالیہ کا تقاضا ہے۔

پکتھال کے ذیل کے ترجمہ سے لگتا ہے کہ وہ تینوں باتوں کو زمانہ حال یعنی دنیا سے متعلق مانتے ہیں:

And thou seest the hills thou deemest solid flying with the flight of clouds: the doing of Allah Who perfecteth all things. Lo! He is Informed of what ye do. (Pickthall)

مطلب یہ کہ تم اس دنیا میں جن پہاڑوں کو دیکھ کر جما ہوا سمجھتے ہو وہ بادلوں کی طرح اڑتے ہیں۔

لیکن یہ مفہوم ایک تو سیاق کلام سے مطابقت نہیں رکھتا، کیونکہ سیاق قیامت سے متعلق ہے، اس کے علاوہ اس دنیا میں پہاڑوں کو اس طرح متحرک ماننا جس طرح بادل اڑتے ہیں تکلف سے بھرپور بات ہے۔

ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ پہلی اور آخری بات مستقبل یعنی روز قیامت کی ہے، اور درمیان والی بات زمانہ حال کی ہے، اس کے لحاظ سے ترجمہ ملاحظہ ہو:

''اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب گھبرا اٹھیں گے۔ صرف وہی اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ چاہے گا۔ اور سب اس کے آگے سرفگندہ ہوکر حاضر ہوں گے۔ اور تم ان پہاڑوں کو بادلوں کی طرح اڑتے ہوئے دیکھو گے جنہیں تم سمجھتے ہو کہ وہ جمے ہوئے ہوئے ہیں''۔(امانت اللہ اصلاحی)

یعنی جن پہاڑوں کو دنیا میں جما ہوا سمجھتے ہو، انہیں آخرت میں بادلوں کی طرح اڑتے ہوئے دیکھو گے۔ یہ ترجمہ دیگر ترجموں کی کمزوریوں سے پاک ہے، اور اس ترجمہ میں جو قوت وجودت ہے وہ دوسرے ترجموں میں نہیں ہے۔

(۳) لَمَّا اور اِذَا کے درمیان فرق:

فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغاً قَالَ هَـذَا رَبِّيْ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لأكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّيْنَ۔(الانعام:۷۷) اس آیت میں دو مرتبہ لَمَّا آیا ہے، اور پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''پھر جب اس نے چاند کو چمکتے دیکھا، بولا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ ڈوب گیا، اس نے کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہوکر رہ جاؤں گا''۔(امین احسن اصلاحی)

کسی جملے میں جب لَمّا ظرفیہ آتا ہے تو اسی طرح ترجمہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی ترجمہ یوں کرے کہ ''جب وہ چاند کو دیکھتا تو بولتا'' تو غلط ہوگا۔ یعنی اس میں کسی عمل کے بار بار ہونے کا مفہوم نہیں بلکہ ماضی میں ایک بار ہونے

کا مفہوم ہوتا ہے، فعل کے بار بار ہونے کا مفہوم اذا سے ادا ہوتا ہے، اور مزید تاکید مطلوب ہو تو کُلَّمَا کا استعمال کرتے ہیں، جبکہ جملہ پر لَمَّا داخل ہو تو ''ایسا ہوا'' کا مفہوم پیدا ہوتا ہے نہ کہ ''ایسا ہوتا'' کا مفہوم۔

البتہ لَمَّا کے اندر اذا کا مفہوم اس وقت پیدا ہوجاتا ہے جب اس سے پہلے اذا آیا ہو، جیسے:

وَإِذَا مَسَّكُمُ الْضُّرُّ فِيُ الْبَحْرِ ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلاَّ إِيَّاهُ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ۔(الاسراء:٦٧)

''اور جب تمہیں سمندر میں مصیبت پہنچتی ہے تو اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو سب غائب ہوجاتے ہیں۔ پھر جب وہ تم کو خشکی کی طرف بچالاتا ہے تو تم اعراض کرنے لگتے ہو''۔

لَمَّا کے سلسلے میں مذکورہ بالا ضوابط کا لحاظ عام طور سے مترجمین قرآن کے یہاں ملتا ہے، تاہم بعض مقامات پر متعدد مترجمین سے لَمَّا کے مفہوم کی ادائیگی کے سلسلے میں لغزش ہوگئی۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(ا) وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَونَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّن الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ۔ فَإِذَا جَاءتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُواْ لَنَا هَـذِهِ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُواْ بِمُوسَى وَمَن مَّعَهُ أَلا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِندَ اللّهُ وَلَـكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لاَ يَعْلَمُونَ۔ وَقَالُواْ مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِن آيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلاَتٍ فَاسْتَكْبَرُواْ وَكَانُواْ قَوْماً مُّجْرِمِيْنَ۔ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُواْ يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِندَكَ لَئِن كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ۔ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَى أَجَلٍ هُم بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ۔ (الاعراف:۱۳۰-۱۳۵)

''اور ہم نے آل فرعون کو قحط سالی اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ ان کو تنبیہ ہو، تو جب خوش حال آتی، کہتے یہ تو ہے ہی ہمارا حصہ اور اگر ان پر کوئی آفت آتی تو اس کو موسی اور اس کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے۔ سن رکھو کہ ان کی قسمت اللہ ہی کے پاس ہے لیکن ان میں کے اکثر نہیں جانتے۔ اور کہتے کہ خواہ تم کیسی ہی نشانی ہمیں مسحور کرنے کے لئے لاؤ ہم تو تمہاری بات باور کرنے کے نہیں، تو ہم نے ان پر بھیجے طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک اور خون- تفصیل کی ہوئی نشانیاں- تو انہوں نے تکبر کیا اور یہ مجرم لوگ تھے۔ اور جب آتی ان پر کوئی آفت تو درخواست کرتے کہ اے موسی تم اپنے رب سے، اس عہد کے واسطہ سے جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، ہمارے لئے دعا کرو۔ اگر تم نے ہم سے یہ آفت دور کردی تو ہم تمہاری بات ضرور مان لیں گے اور تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے۔ تو جب ہم ان سے دور کردیتے آفت کو کچھ مدت کے لئے جس تک وہ پہنچنے والے ہوتے تو وہ دفع عہد توڑ دیتے''۔ (امین احسن اصلاحی)

فَإِذَا جَاءتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُواْ لَنَا هَـذِهِ کا ترجمہ کیا ہے: ''تو جب خوش حال آتی، کہتے یہ تو ہے ہی ہمارا حصہ''۔ چونکہ اس جملے میں اذا ہے اس لئے یہ ترجمہ درست ہے۔ لیکن وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُواْ يَا مُوسَى کا ترجمہ کیا گیا ہے: ''اور جب آتی ان پر کوئی آفت تو درخواست کرتے کہ اے موسی''۔ یہاں اذا نہیں ہے بلکہ لَمَّا ہے،

اس لئے درست ترجمہ ہوگا: ''اور جب آیا ان پر عذاب تو درخواست کی''، مزید برآں الرجز معرفہ ہے اس کے ترجمہ میں کوئی کا اضافہ صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ کا ترجمہ: ''تو جب ہم ان سے دور کر دیتے آفت کو''، درست نہیں ہے بلکہ درست ترجمہ یوں ہوگا: ''تو جب ہم نے ان سے عذاب کو ہٹا دیا''۔

یہی غلطی سید مودودی کے ترجمہ میں بھی نظر آتی ہے: ''جب کبھی اُن پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے: اے موسیٰ، تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر ہمارے حق میں دعا کر، اگر اب کے تو ہم پر سے یہ بلا ٹلوا دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔ مگر جب ہم ان پر سے اپنا عذاب ایک وقت مقرر تک کے لیے، جس کو وہ بہر حال پہنچنے والے تھے، ہٹا لیتے تو وہ یکلخت اپنے عہد سے پھر جاتے'' اس ترجمہ میں مذکورہ بالا غلطی کے علاوہ لفظ ''جب کبھی'' بھی درست نہیں ہے، اس کی جگہ صرف ''جب'' ہونا چاہئے۔

احمد رضا خان کے یہاں بھی یہ غلطی نظر آتی ہے:

''جب ان پر عذاب پڑتا کہتے اے موسیٰ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے پاس ہے بیشک اگر تم ہم پر سے عذاب اٹھا دو گے تو ہم ضرور تم پر ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ کر دیں گے، پھر جب ہم ان سے عذاب اٹھا لیتے ایک مدت کے لیے جس تک انہیں پہنچنا ہے جبھی وہ پھر جاتے''۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَى بِآيَاتِنَا إِلَى فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ فَلَمَّا جَاءهُم بِآيَاتِنَا إِذَا هُم مِّنْهَا يَضْحَكُونَ۔ وَمَا نُرِيهِم مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا وَأَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ وَقَالُوا يَا أَيُّهَا السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِندَكَ إِنَّنَا لَمُهْتَدُونَ۔ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ۔ (الزخرف:۴۶-۵۰)

''اور بے شک ہم نے موسیٰ کو- اپنی نشانیوں کے ساتھ -فرعون اور اس کے اعیان کے پاس بھیجا تو اس نے ان کو دعوت دی کہ میں تمہارے پاس عالم کے خداوند کا رسول ہو کر آیا ہوں تو جب وہ ان کے پاس ہماری نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ ان نشانیوں کا مذاق اڑاتے۔ اور ہم ان کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھاتے رہے اور ہم نے ان کو عذاب میں بھی پکڑا تا کہ وہ رجوع کریں۔ اور انہوں نے درخواست کی کہ اے ساحر اپنے رب سے اس عہد کی بنا پر، جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، ہمارے لئے دعا کرو، اب ہم ضرور ہدایت پانے والے بن کر رہیں گے۔ تو جب ہم ان سے عذاب ٹال دیتے تو وہ اپنا عہد توڑ دیتے''۔ (امین احسن اصلاحی)

یہاں آیت نمبر ۴۷ کے ترجمہ میں لَمَّا کے مفہوم کی رعایت کی گئی ہے، لیکن آیت نمبر ۵۰ کے ترجمہ میں لَمَّا کی رعایت نہیں ہو سکی، اس آیت کا درست ترجمہ یوں ہوگا: تو جب ہم نے ان سے عذاب ٹال دیا تو انہوں نے اپنا عہد توڑ دیا۔

یہی غلطی سید مودودی کے ترجمہ میں بھی نظر آتی ہے: ''مگر جوں ہی کہ ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے''۔

عجیب بات یہ ہے کہ سورہ اعراف کی آیت ۱۳۴/اور ۱۳۵/اور سورہ زخرف کی آیت ۵۰/کا اسلوب بھی ایک ہے اور ایک ہی واقعہ کی طرف اشارہ بھی ہے، اس کے باوجود بہت سارے مترجمین جیسے احمد رضا خان، فتح محمد جالندھری، محمد جونا گڑھی اور طاہر القادری وغیرہم نے سورہ زخرف کی آیت کا درست ترجمہ کیا ہے مگر اسی سے ملتی جلتی سورہ اعراف کی دونوں آیتوں کے ترجمہ میں لَمَّا کے بجائے اذا کا ترجمہ کردیا ہے۔

غلطی کی وجہ غالبا یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں ایک تو آیات کا ذکر ہے یعنی طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک اور خون، اور اس کے بعد ایک مقام پر عذاب اور ایک مقام پر رجز کے نازل ہونے کا ذکر ہے، لگتا ایسا ہے کہ لوگوں نے عذاب اور رجز سے ان نشانیوں کو مراد لے لیا جو یکے بعد دیگرے آئیں، حالانکہ عذاب اور رجز سے وہ عذاب مراد ہے جو ان نشانیوں سے اعراض کرنے کے بعد نازل کیا گیا تھا، اور وہ ایک بار نازل کیا گیا تھا اور پھر ان کے قول وقرار کے بعد ان پر سے اسے ہٹا لیا گیا تھا۔

غلطی کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دونوں مقامات پر إِذَا هُمْ يَنكُثُون مضارع کا صیغہ آیا ہے، جس کا ترجمہ بعض لوگوں نے کیا ہے: ''تبھی وہ وعدہ توڑ ڈالتے'' (محمود الحسن) حالانکہ موقعہ کے لحاظ سے ترجمہ ہوگا ''تو وہ لگے وعدہ توڑنے'' اس کی قریب ترین مثال سورہ زخرف میں ٹھیک اسی اسلوب کی آیت نمبر ۴۷/ ہے، فَلَمَّا جَاءهُم بِآيَاتِنَا إِذَا هُم مِّنْهَا يَضْحَكُون (۴۷) شیخ الہند نے یہاں ترجمہ کیا ہے، ''پھر جب لایا ان کے پاس ہماری نشانیاں وہ تو لگے ان پر ہنسنے'' یہ ترجمہ صحیح ہے اور اسی طرح سے ترجمہ آیت نمبر ۵۰/کا ہونا چاہئے تھا، لیکن شیخ الہند نے یہاں ترجمہ کیا: ''پھر جب اٹھالی ہم نے ان پر سے تکلیف تبھی وہ وعدہ توڑ ڈالتے''۔ اس ترجمہ کی کمزوری صاف ظاہر ہے۔ شیخ امین احسن اصلاحی سے یہی غلطی آیت نمبر ۴۷/ میں ہوئی: ''تو جب وہ ان کے پاس ہماری نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ ان نشانیوں کا مذاق اڑاتے'' یہاں ''مذاق اڑاتے'' کے بجائے ''لگے مذاق اڑانے'' درست ہے۔

(۲) هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلاً خَفِيفاً فَمَرَّتْ بِهِ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحاً لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِين۔ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحاً جَعَلاَ لَهُ شُرَكَاء فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللّهُ عَمَّا يُشْرِكُون۔ (الاعراف ۱۸۹:۔۱۹۰)

''وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا کہ وہ اس سے تسکین پائے۔ تو جب وہ اس کو چھالیتا ہے تو وہ اٹھالیتی ہے ایک ہلکا سا حمل، پھر وہ اس کو لئے (کچھ وقت گزارتی ہے)۔ تو جب بوجھل ہوتی ہے، دونوں اللہ، اپنے رب، سے دعا کرتے ہیں: اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد بخشی، ہم

تیرے شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔تو جب اللہ ان کو تندرست اولاد دے دیتا ہے تو اس کی بخشی ہوئی چیز میں وہ اس کے لئے دوسرے شریک ٹھہراتے ہیں۔اللہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں''۔(امین احسن اصلاحی)

اس ترجمہ میں بھی لَمّاَ کے استعمال کی رعایت نہیں کی جاسکی ہے، فتح محمد جالندھری کے ترجمہ میں بھی یہی غلطی ہے،البتہ اکثر مترجمین نے اس کا لحاظ کیا ہے، ذیل کا ترجمہ اس کی ایک مثال ہے:

''وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لیے لیے وہ چلتی پھرتی رہی پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ، اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح و سالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی اِس بخشش و عنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے اللہ بہت بلند و برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں''۔(سید مودودی)

(۴)فعل ماضی کے ترجمہ میں غلطی

کبھی کبھی بعض مترجمین بغیر کسی وجہ اور قرینہ کے فعل ماضی کا ترجمہ حال اور مستقبل کا کر دیتے ہیں، مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) أَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ أَن يَسْبِقُونَا سَاء مَا يَحْكُمُون۔(العنکبوت:۴)

''کیا جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں وہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے''۔(امین احسن اصلاحی)

يَسْبِقُونَا فعل مضارع ہے اور اس کے لحاظ سے یہ ترجمہ درست ہے، تاہم ذیل کی آیت میں یہی فعل ماضی کے صیغہ میں آیا ہے اور اس کا ترجمہ ماضی کا ہونا چاہئے تھا مگر بعض مترجمین نے مستقبل کا ترجمہ کیا، جیسے:

(۲) وَلاَ يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ سَبَقُواْ إِنَّهُمْ لاَ يُعْجِزُون۔(الانفال:۵۹)

''اور یہ کافر یہ گمان نہ کریں کہ وہ نکل بھاگیں گے، وہ ہمارے قابو سے باہر نہیں جاسکیں گے''۔(امین احسن اصلاحی)

درست ترجمہ یوں ہے:''اور ہر گز کافر اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ وہ ہاتھ سے نکل گئے بیشک وہ عاجز نہیں کرتے''۔(احمد رضا خان)

(۳) أَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا۔(الانبیاء:۳۰)

''کیا ان کفر کرنے والوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں بند ہوتے ہیں، پھر ہم ان کو کھول دیتے ہیں''۔(امین احسن اصلاحی)

اس آیت میں بھی فعل ماضی ہے لیکن اس کا ترجمہ حال کا کر دیا ہے۔

صحیح ترجمہ یوں ہوگا: ''کیا کافر لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان وزمین باہم ملے جلے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا''۔ (محمد جوناگڑھی)

''کیا ان کفر کرنے والوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں باہم جڑے ہوئے تھے، پھر ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا''۔ (امانت اللہ اصلاحی)

(۴) وَجَاءتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَلِكَ مَا كُنتَ مِنْهُ تَحِيدُ۔ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ذَلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ۔ وَجَاءتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ۔ (ق:۱۹/تا۲۱/)

''اور موت کی غشی شدنی کے ساتھ آپہونچی، یہ ہے وہ چیز جس سے تو کترا تا رہا تھا۔ اور صور پھونکا جائے گا۔ وہ ہماری وعید کے ظہور کا دن ہوگا۔ اور ہر جان اس طرح حاضر ہوگی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہوگا اور ایک گواہ''۔ (امین احسن اصلاحی)

''اور موت کی بیہوشی حقیقت کھولنے کو طاری ہوگئی۔ (اے انسان) یہی (وہ حالت) ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔ اور صور پھونکا جائے گا۔ یہی (عذاب کے) وعید کا دن ہے۔ اور ہر شخص (ہمارے سامنے) آئے گا۔ ایک (فرشتہ) اس کے ساتھ چلانے والا ہوگا اور ایک (اس کے عملوں کی) گواہی دینے والا''۔ (فتح محمد جالندھری)

یہاں تین آیتیں ہیں جن میں سے ہر ایک فعل ماضی سے شروع ہوئی ہے، مذکورہ ترجموں میں پہلی آیت کا ترجمہ تو ماضی سے کیا گیا ہے مگر بعد کی دونوں آیتوں کا ترجمہ مستقبل کا کیا گیا ہے۔ حالانکہ تینوں آیتوں کا ماضی کا ترجمہ نہیں کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ محمد جوناگڑھی، اشرف علی تھانوی اور طاہر القادری کے ترجموں میں بھی یہی طرز اختیار کیا گیا ہے۔

جبکہ بعض لوگوں نے تینوں آیتوں کے ماضی کے افعال کا ترجمہ ماضی ہی کا کیا ہے اور یہی درست ہے جیسے:

''اور آئی موت کی سختی حق کے ساتھ یہ ہے جس سے تو بھاگتا تھا، اور صور پھونکا گیا یہ ہے وعدہ عذاب کا دن۔ اور ہر جان یوں حاضر ہوئی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ'' (احمد رضا خان) سید مودودی اور شیخ الہند کے ترجموں میں بھی یہی انداز ہے۔

(۵) وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَن شَاء اللَّهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَى فَإِذَا هُم قِيَامٌ يَنظُرُونَ۔ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتَابُ وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاء وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ۔ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُونَ۔ وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى جَهَنَّمَ زُمَراً حَتَّى إِذَا جَاؤُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ

مِّـنـكُـمْ يَتْـلُـونَ عَـلَيْـكُـمْ آيَـاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا قَالُوا بَلَى وَلَكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْـعَـذَابِ عَـلَـى الْـكَافِرِينَ۔ قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ۔ وَسِيقَ الَّـذِيـنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَراً حَتَّى إِذَا جَاؤُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُـمْ فَـادْخُـلُـوهَـا خَـالِدِينَ۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ۔ (الزمر:۶۸/تا۷۴/)

''اورصُور پھونکا جائے گا تو بے ہوش ہوجائیں گے جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں مگر جسے اللہ چاہے پھروہ دوبارہ پھونکا جائے گا جبھی وہ دیکھتے ہوئے کھڑے ہوجائیں گے۔اورزمین جگمگا اٹھے گی اپنے رب کے نور سے اور رکھی جائے گی کتاب اور لائے جائیں گے انبیاء اور یہ نبی اور اس کی امت کے ان پر گواہ ہوں گے اور لوگوں میں سچا فیصلہ فرما دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا، اور ہر جان کو اس کا کیا بھرپور دیا جائے گا اور اسے خوب معلوم جو وہ کرتے تھے، اور کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے گروہ گروہ یہاں تک کہ جب وہاں پہنچیں گے اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے داروغہ ان سے کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے وہ رسول نہ آئے تھے جو تم پر تمہارے رب کی آیتیں پڑھتے تھے اور تمہیں اس دن سے ملنے سے ڈراتے تھے، کہیں گے کیوں نہیں مگر عذاب کا قول کافروں پر ٹھیک اترا، فرمایا جائے گا جاؤ جہنم کے دروازوں میں اس میں ہمیشہ رہنے، تو کیا ہی برا ٹھکانا متکبروں کا، اور جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ان کی سواریاں گروہ گروہ جنت کی طرف چلائی جائیں گی، یہاں تک کہ جب وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے اور اس کے داروغہ ان سے کہیں گے سلام تم پر تم خوب رہے تو جنت میں جاؤ ہمیشہ رہنے، اور وہ کہیں گے سب خوبیاں اللہ کو جس نے اپنا وعدہ ہم سے سچا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث کیا کہ ہم جنت میں رہیں جہاں چاہیں، تو کیا ہی اچھا ثواب کامیوں (اچھے کام کرنیوالوں) کا۔(احمد رضا خان)

مذکورہ بالا آیتوں میں زیادہ تر افعال ماضی کے صیغہ میں آئے ہیں، اور ان کا ترجمہ ماضی کا ہونا چاہئے تھا، لیکن عام طور سے مترجمین نے ان کا ترجمہ مستقبل کا کیا ہے، یہ درست ہے کہ ان آیتوں میں جن واقعات اور مناظر کا بیان ہے ان کا تعلق مستقبل میں واقع ہونے والے قیامت کے دن سے ہے، لیکن ان کو ماضی کے صیغہ سے بیان کرنا بھی بلاسبب تو نہیں ہے کہ ترجمہ میں اس کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ دراصل جب اس طرح کی آیتوں کا ترجمہ مستقبل کا کردیا جاتا ہے تو ترجمہ پڑھتے وقت وہ حکمت ذہن میں آنہیں سکتی ہے جو ماضی کے صیغہ سے مستقبل کے واقعات کو بیان کرنے کے پیچھے موجود ہوا کرتی ہے۔

(۵) مفعول بہ موجود یا محذوف

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کلام کے اندر مفعول بہ موجود ہوتا ہے لیکن مترجم کا دھیان ادھر نہیں جاتا اور وہ کسی محذوف کو مفعول بہ ماننے کی کوشش کرتا ہے، محذوف کو مقدر ماننے میں پھر اختلاف بھی ہوتا ہے، کسی کا ذہن ایک

چیز کی طرف جاتا ہے تو کسی کا ذہن کسی دوسری چیز کی طرف۔ مثال ملاحظہ ہو:

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِيُ الْآخِرِيْنَ۔ سَلَامٌ عَلَى نُوحٍ فِيُ الْعَالَمِيْن۔ (الصافات:۷۸۔۷۹)

سورہ صافات میں یہ آیت چار مقام پر آئی ہے، تین جگہوں پر واحد اور ایک جگہ مثنی کی ضمیر کے ساتھ۔ بعض مترجمین کو اس میں حیرانی ہوئی ہے کہ ان آیتوں میں ترکنا کا مفعول بہ کیا ہے اور کس چیز کو چھوڑنے یا رہنے دینے کی بات کہی گئی ہے، کسی نے مفعول بہ کی جگہ ایک گروہ کو مقدر مانا: ''اور ہم نے اس (کے طریقہ) پر پچھلوں میں (ایک گروہ کو) چھوڑا'' (امین احسن اصلاحی)۔ کسی نے تعریف وتوصیف اور ذکر جمیل کو مقدر مانا: ''اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف وتوصیف چھوڑ دی'' (سید مودودی) ''اور پیچھے آنے والوں میں ان کا ذکر (جمیل باقی) چھوڑ دیا'' (فتح محمد جالندھری)

مفسرین ومترجمین کے ایک دوسرے گروہ نے مفعول بہ کو محذوف ماننے کے بجائے اگلی پوری آیت کو مفعول بہ قرار دیا۔

(۱) وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِيُ الْآخِرِيْنَ۔ سَلَامٌ عَلَى نُوحٍ فِيُ الْعَالَمِيْن۔ (الصافات:۷۸۔۷۹)

''اور ہم نے ان کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات رہنے دی کہ نوح پر سلام ہو عالم والوں میں''۔ (اشرف علی تھانوی)

(۲) وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِيُ الْآخِرِيْنَ۔ سَلَامٌ عَلَى إِبْرَاهِيْمَ۔ (الصافات:۱۰۸۔۱۰۹)

''اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لئے رہنے دی کہ ابراہیم پر سلام ہو''۔ (اشرف علی تھانوی)

(۳) وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِيُ الْآخِرِيْن۔ سَلَامٌ عَلَى مُوسَى وَهَارُون۔ (الصافات:۱۱۹۔۱۲۰)

''اور ہم نے ان دونوں کے لئے پیچھے آنے والوں میں یہ بات رہنے دی کہ موسی اور ہارون پر سلام ہو''۔ (اشرف علی تھانوی)

(۴) وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِيُ الْآخِرِيْن۔ سَلَامٌ عَلَى إِلْ يَاسِيْن۔ (الصافات:۱۲۹۔۱۳۰)

''اور ہم نے الیاس کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات رہنے دی کہ الیاسین پر سلام ہو''۔ (اشرف علی تھانوی)

امام زمخشری لکھتے ہیں:

"وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِيُ الْآخِرِيْن من الأمم هذه الكلمة، وهى سَلَامٌ عَلَى نُوحٍ يعنى يسلمون عليه تسليما، ويدعون له، وهو من الكلام المحكى، كقولك: قرأت سورة أنزلناها"۔

کسی محذوف کو مفعول بہ ماننے کے بجائے موجود کو مفعول بہ مان لینا زیادہ مناسب ہے بطور خاص اگر کوئی مانع نہ ہو، مزید برآں یہاں سلام والی آیت کو ترکنا کا مفعول بہ مان لینے کے لئے ایک مضبوط قرینہ یہ بھی ہے کہ

سلام والی آیت بھی چار مرتبہ ہی آئی ہے اور چاروں مقامات پر وَتَرَکْنَا عَلَیْہِ فِیْ الْآخِرِیْن کے فوراً بعد آئی ہے۔ نہ کہیں دونوں کے درمیان فصل ہوا ہے اور نہ ہی کہیں تقدیم و تاخیر ہوئی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ اس نحوی ترکیب کے نتیجہ میں جو معنی سامنے آتا ہے وہ خوب تر ہے۔

(۶) فعل اور مفعول به کے درمیان فصل کا اسلوب

یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَكُمْ وَیَهْدِیَكُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِن قَبْلِكُمْ۔ (النساء:۲۶)

اکثر مترجمین نے پہلے فعل یعنی لِیُبَیِّنَ لَكُمْ کے مفعول بہ کو محذوف مان کر اس طرح ترجمہ کیا ہے:

''اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم پر (اپنی آیتیں) واضح کردے اور تمہیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت بخشے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں''۔ (امین احسن اصلاحی)

''اللہ چاہتا ہے کہ اپنے احکام تمہارے لئے بیان کردے اور تمہیں اگلوں کی روشیں بتادے''۔ (احمد رضا خان)

بعض لوگوں نے سُنَنَ کو دونوں فعلوں کا مفعول بہ مان لیا ہے اور ترجمہ اس طرح کیا ہے:

''اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اُن طریقوں کو واضح کرے اور اُنہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحاء کرتے تھے''۔ (سید مودودی)

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال یہ ہے کہ سُنَن کو لِیُبَیِّنَ لَكُمْ کا مفعول بہ مانا جائے، اور یہ مان لیا جائے کہ یَهْدِیَكُم کے ذریعہ دونوں کے درمیان فصل ہو گیا ہے، مزید یہ کہ یَهْدِیَكُم کا ترجمہ مفعول بہ کے بغیر کیا جائے۔ اس طرح آیت کا مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تمہارے سامنے اگلوں کی روش بیان کرنا چاہتا ہے، مزید یہ کہ ہدایت سے بھی نوازنا چاہتا ہے۔ ہدایت سے مراد عمومی ہدایت ہے نہ کہ اگلوں کی روش کی ہدایت۔ دوسرے ترجموں پر اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ اگلوں کی روش کو بیان کرنا تو بخوبی سمجھ میں آتا ہے، البتہ ان کی روش کی ہدایت دینے کی بات تکلف سے خالی نہیں ہے۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ فعل اور مفعول بہ کے درمیان ایک جملے کے ذریعہ فصل ہو سکتا ہے، اس کی مثال خود قرآن مجید میں ہے، جیسے:

فَاغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ وَأَیْدِیَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُواْ بِرُؤُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَیْنِ۔ (المائدۃ:۶)

بظاہر یہاں وَامْسَحُواْ بِرُؤُوسِكُمْ کے ذریعہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فصل ہے، ابوالبقاء عکبری کے بقول:

هو معطوف على الوجوه والأيدى أى فاغسلوا وجوهكم وأيديكم وأرجلكم وذلك جائز فى العربية بلا خلاف۔ (التبیان فی اعراب القرآن)

لیکن درحقیقت یہاں وَامسَحُوا بِرُؤُوسِکُمْ کے ذریعہ فاغسلوا فعل اوراس کے ایک مفعول بہ یعنی وَأَرْجُلَکُمْ کے درمیان فصل کیا گیا ہے۔

(۷) مصدق له اور مصدق به میں فرق

لفظ مصدق قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے، اوراکثر مقامات پر لام کے صلہ کے ساتھ آیا ہے، اس کا ترجمہ کسی خبر یا پیشین گوئی کا مصداق ہونا ہے جیسا کہ علامہ فراہیؒ کی مشہور تحقیق سے ثابت ہوتا ہے، صاحب تدبرقرآن نے عموما ترجمہ کرتے ہوئے اس رائے کی پابندی کی ہے، البتہ سہوا کہیں کہیں تفسیر تدبر قرآن میں تصدیق کرنے کا ترجمہ کردیا ہے، ایسے بعض مقامات کی تصحیح بعد میں اس ترجمہ میں کردی گئی ہے جو نظر ثانی کے بعد خالد مسعود کی تلخیص کے ساتھ شائع ہوا ہے (مثال کے لئے ملاحظہ ہوسورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۸/کا ترجمہ) اور بعض مقامات پر یہ غلطی ہنوز باقی ہے (مثال کے لئے ملاحظہ ہوسورہ احقاف کی آیت نمبر ۳۰/کا ترجمہ)۔

قرآن مجید میں ایک مقام پر لفظ مصدق باء کے صلہ کے ساتھ آیا ہے، اورصاحب تدبرقرآن نے وہاں بھی مصداق والا مفہوم اختیار کیا ہے، ترجمہ ملاحظہ ہو:

فَنَادَتْهُ الْمَلآئِکَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّيْ فِيْ الْمِحْرَابِ أَنَّ اللّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَى مُصَدِّقاً بِکَلِمَةٍ مِّنَ اللّهِ وَسَيِّداً وَحَصُوراً وَنَبِيّاً مِّنَ الصَّالِحِيْنَ۔ (آل عمران:۳۹)

''تو فرشتوں نے اس کوندادی جبکہ وہ محراب میں نماز میں کھڑا تھا کہ اللہ تجھ کو یحیی کی خوشخبری دیتا ہے جواللہ کے ایک کلمہ کے مصداق، سردار، لذت دنیا سے کنارہ کش اور زمرہ صالحین سے نبی ہوں ہوں گے''۔(امین احسن اصلاحی)

مولانا امانت اللہ اصلاحی کی رائے یہ ہے کہ مصدق جب لام صلہ کے ساتھ آتا ہے تب تو مصداق ہونے کا مفہوم ہوتا ہے، لیکن جب باءصلہ کے ساتھ آتا ہے تو مصداق ہونے کا مفہوم نہیں ہوتا ہے بلکہ تصدیق کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہاں ترجمہ ہوگا: ''اللہ کے ایک کلمہ کی تصدیق کرنے والا'' اللہ کے ایک کلمہ سے مراد حضرت عیسی علیہ السلام ہیں، جیسا کہ ان کے سلسلے میں خود قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے: إِذْ قَالَتِ الْمَلآئِکَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللّهَ يُبَشِّرُكِ بِکَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهاً فِيْ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ۔ (آل عمران:۴۵)

عیدالاضحیٰ: مقصد اور پیغام

مروہ سبحانی فلاحی، معلّمہ شعبہ اعلیٰ کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح

عید الاضحی کی آمد آمد ہے۔ یوں تو ہم اسے مسرت کے طور پر مناتے ہیں لیکن اگر تاریخی حیثیت سے اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دن آتا ہے تا کہ ہمیں ہمارے اگلوں کے روشن کارناموں کی یاد دلائے اور ہماری زندگیوں کو ان کے سانچے میں ڈھال دے۔ وہ ہمیں آئینہ دکھائے کہ تم جن ہستیوں کی بے تابانہ دعاؤں کا نتیجہ ہو ان کی زندگیاں کیسی ہوا کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے معبودِ حقیقی کی رضامندی کے لیے کیسی کیسی قربانیاں دیں، اور تم ہو کہ انہی کے مذہب کے علمبردار ہونے کے باوجود قربانیوں سے کتنا دور بھاگتے ہو۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی توحید کی صدا بلند کرنے میں لگا دی اور تم ہو کہ انہی کی ملت کے پیرو ہونے کے باوجود اس فریضہ سے کتنا کتراتے ہو۔ انہوں نے کفر وشرک کی تاریکی مٹانے کی خاطر اپنے وطن گھر بار سب کو خیر باد کہہ دیا اور تم ہو کہ تمہاری بے جا مصروفیات تمہیں اپنے دائرۂ کار سے باہر ہی نہیں نکلنے دیتیں۔

غرض یہ دن آتا ہے تا کہ ہم اپنا احتساب کریں، اپنے اندر جھانک کر دیکھیں، اپنی شخصیت کا جائزہ لیں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کا کفارہ ادا کریں اور از سرِ نو اپنی زندگیوں کا آغاز کریں۔

مگر افسوس کہ ہم نے اس دن کو دوسرے مذاہب کے تیوہاروں کی طرح محض ایک تیوہار کی حیثیت دے دی ہے۔ عید کی خوشیوں اور مسرتوں میں ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ یہ عید ہمارے لیے کیا پیغام لائی ہے۔ یہ کس مقصد سے آئی ہے اور ہمیں کیا کچھ دینا چاہتی ہے۔

کیا ہم نے کبھی غور کیا کہ عید کا یہ مبارک دن اپنے اندر صبر وعزیمت کی کیسی داستان سمیٹے ہوا ہے۔ ہمارے اجداد حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی صبر وعزیمت بھری داستان، ان کی حیات کے سب سے کٹھن مرحلے کی داستان، ایک ایسی داستان جسے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دل رشک سے معمور ہو جاتا ہے کہ کاش ہم بھی طاعت وعبودیت کی کچھ ویسی ہی داستان رقم کر پاتے جو ہمارے اجداد نے رقم کی ہے۔

آج کے دن، ہاں آج ہی کے دن، اس روئے زمین پر خدا کے دو مخلص اور فرمانبردار بندوں نے خلوص وللّٰہیت اور طاعت وفرمانبرداری کی ایسی مثال قائم کی جس کی کوئی نظیر نہیں۔

آج کے دن حضرت ابراہیمؑ جیسے نرم دل اور بردبار بندۂ خدا نے جو کہ شفقت ومحبت کا پیکر اور ہمدردی وغم گساری کی تصویر تھے، اپنے محبوب آقا کے ایک اشارے پر اپنے اکلوتے جوان بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی گردن پر چھری رکھنے میں کچھ تأمل نہ کیا، جبکہ وہ ان کے بوڑھاپے کا واحد سہارا تھا۔ ان کی بجھتی ہوئی زندگی کا آخری روشن چراغ تھا۔ ان کی برسوں کی آہ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی کا ثمرہ تھا۔ اور قربان جایئے اس بیٹے پر جس نے باپ کے حکم میں خدا کی رضامندی کا جلوہ محسوس کیا اور فوراً گردن جھکا دی۔ خدا کی قسم آسمان وزمین نے اس سے پہلے کبھی ایسا نظارہ نہ دیکھا تھا۔

دونوں باپ بیٹوں نے جیسے ہی قربانی کی تیاریاں مکمل کر لیں اور حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی گردن پر چھری پھیرنے کا ارادہ کیا، فوراً رحمت الٰہی جوش میں آ گئی اور ایک فرشتہ دنبہ لے کر حاضر ہو گیا، اور بڑھ کر حضرت ابراہیمؑ کا ہاتھ تھام لیا کہ آپ کے رب کو آپ کے بیٹے کی جان نہیں بلکہ آپ کے صبر وایمان کا امتحان لینا تھا، سو آپ اس میں پورے اتر گئے، خوش ہو جایئے کہ آپ کے رب کے یہاں آپ کے اس جذبہ کی بہت قدر ہوئی اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی جان کے فدیے کے طور پر اس دنبے کو ذبح کیا۔

وہ دن ہے اور آج کا دن، ہر سال اس دن کو یادگار کے طور پر منایا جاتا ہے اور ہزاروں لاکھوں جانور خدا کی راہ میں قربان کیے جاتے ہیں۔

ذرا ٹھہر کر سوچئے کہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی قربانی کو خدا کے یہاں کتنا بڑا مقام ملا، ان کی کتنی قدر افزائی ہوئی کہ رب تعالیٰ نے ان کے اس عمل کو قیامت تک کے لیے یادگار بنا دیا، اور ان کی اس ایک قربانی کی یاد میں ہر سال اتنی جانیں قربان کرنے کا حکم دیا۔ یہ عید الاضحیٰ کے دن ہم جو جانور قربان کرتے ہیں وہ اسی نیک عمل کی ہی تو یادگار ہے۔ جانور قربان کر کے گویا ہم اپنے رب کے سامنے اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ اے رب آج ہم تیری رضا کے لیے اپنے جانور قربان کر رہے ہیں کل کو اگر ضرورت پڑی تو ہم اپنی جانیں حاضر کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

یہ ہے اس تیوہار کی حقیقت اور اس سے جڑی ہوئی روشن تاریخ۔ اس تاریخ کی یاد میں ہمیں اپنے محاسبہ کی ضرورت ہے۔

ایسا نہیں کہ اس دن خوشیاں منانا ہم پر حرام ہے مگر خوشیوں اور سرمستیوں میں اس عید کے مقاصد کو بھول جانا اور یہ فراموش کر دینا کہ یہ عید ہمارے لیے کیا پیغام لائی ہے سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔

اسی نکتہ کی یاددہانی کے لیے قرآن میں رب کائنات کا ارشاد ہے:

لَن يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِن يَنَالُهُ التَّقْوَى مِنكُمْ (سورہ حج آیت:۳۷)

ترجمہ: ''نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں، نہ خون۔ مگر اسے تمہارا تقوی پہنچتا ہے''۔

یعنی اس عید کو منانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے اندر بھی وہی جذبۂ قربانی، وہی ایمانی کیفیت اور

محبوب حقیقی سے وہی عشق اور لگاؤ پیدا ہوجائے جس کا ثبوت حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے اپنی زندگیوں میں دیا۔

اگر کوئی شخص محض رسمی طور پر کسی جانور کی گردن پر چھری چلاتا ہے، اس حال میں کہ اس کا دل اس جذبہ اور اس روح سے خالی ہے تو وہ گویا ناحق ایک جانور کا خون بہاتا ہے۔ خدا کو اس کے خون اور گوشت کی کوئی حاجت نہیں۔

ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

ان الله لا ینظر الی صورکم ولا الیٰ أموالکم و لکن ینظر الی قلوبکم و أعمالکم۔

ترجمہ: ''اللہ تمہاری شکلوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔''

مگر افسوس اس بات کا ہے کہ آج ہمارے سوچنے کا انداز ہی بدل گیا ہے۔ عید کے مقاصد کے بارے میں گفتگو کی جائے تو عموماً صرف یہی مقاصد زیر بحث آتے ہیں کہ اس کے ذریعے غریبوں کی مدد ہوتی ہے، انسانی فطرت کو تفریح ملتی ہے، تعلقات میں بہتری آتی ہے، نفرت و عناد کی جگہ الفت و محبت کو جگہ ملتی ہے، اور یہ کہ جب ساری دنیا کے مسلمان ایک وقت میں ایک ساتھ جشن منا رہے ہوتے ہیں تو ان کے اتحاد اور ان کی قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

جبکہ یہ عید کے مقاصد نہیں اس کی برکتیں ہیں۔ قرآن و حدیث میں جہاں کہیں بھی عیدالاضحیٰ کا ذکر آتا ہے وہاں صرف ایک ہی مقصد پر زور ڈالا گیا ہے کہ اس دن سارے مسلمان ایک جماعت ہو کر اپنے اجداد کی قربانیوں کی یاد منائیں اور یہ عہد کریں کہ اے رب ہم تمام امت مسلمہ بھی تیری راہ میں قربانیاں دینے کے لیے ایسے ہی حاضر ہیں جیسے ہمارے اجداد نے قربانیاں دی تھیں۔ کوئی بھی دنیوی مفاد، کوئی تعلق، کوئی محبت یا کوئی بھی اندیشۂ سود و زیاں ہمیں تیری راہ میں قربان ہونے سے نہیں روک سکے گا۔

سلمان عودة نے کیا خوبصورت بات کہی ہے:

و لعل من الأشياء المهمة جدا أن الناس دائما يتبارون فی الأعمال الظاهرة والأعمال الظاهرة لا شک أنها مطلوبة.. لکن ينبغی أن يعرف أن المقصود فی الأعمال الظاهرة هو التأثير علی القلب.

سلمان عودہ عرب دنیا کے ایک عظیم اسکالر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ''یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ لوگ ہمیشہ ظاہری اعمال کی جانب بھاگتے ہیں، یقیناً ظاہری اعمال بھی اپنی جگہ مطلوب ہیں، لیکن یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ ظاہری اعمال کا مقصود بھی اندرونی اثرات ہی ہیں''۔

ایک سفر زنداں کا......آوازوں کے جنگل میں

سعید اختر اعظمی، معلم دارۃ السلام انٹرنیشنل، دہلی پبلک اسکول، ریاض، سعودی عرب

یہ سلطنت حیرانیہ کے زنداں میں گزارے ہوئے شب و روز کی روداد ہے۔ راوی اس میں مرکزی کردار رکھتے ہوئے بھی مرکزیت نہیں رکھتا۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ جرم کے انسداد کے لیے مجرم کو جیل کی ہوا ضرور کھلانی چاہیے مگر جرم کی سنگینی اور شراکت داروں سے مساویانہ برتاؤ کو بھی پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ اُس کا یہ شکوہ ہے کہ سلطنت کے کارندے خود ہی ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ عام آدمی 'حجرة الاجرة' کو چھوڑ کر یہاں آنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں ملکی حضرات کم اور غیر ملکی افراد زیادہ ہیں۔ غیر ملکیوں کی کثیر تعداد یہاں روزانہ آتی رہتی ہے۔ یہ تعداد جب سلطنت کے ذمہ داروں کو بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے تو وہ ان کے اخراج کے لیے نت نئی تراکیب سوچنے لگتے ہیں۔ جیل جانے کا مرحلہ انہی تراکیب میں سے ایک ہے جس کے بعد منزل 'لوٹ پیچھے کی طرف' ہی رہ جاتی ہے۔

راوی ان ہی عام غیر ملکی لوگوں میں سے ایک ہے جن کو سلطنت حیرانیہ میں قیام کے لیے 'رہائشی اجازت نامہ' ہمہ وقت رکھنا ضروری ہے۔ جیب میں پیسے بھلے نہ ہوں مگر اس کا ہونا ناگزیر ہے۔ اسی طرح سانس لینا بھول جانے میں کوئی قباحت نہیں مگر اجازت نامہ بھول جانا سنگین غلطی ہے۔ یہ خطا کوئی بھی نہیں کرنا چاہتا مگر اداروں کی لاپرواہی کے سبب دانستہ و نادانستہ ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

راوی صبح و شام چہل قدمی کا قائل ضرور ہے مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ خواہ مخواہ سڑکیں ناپی جائیں۔ دیارِ غیر میں جو لمحہ رزق حلال کی سعی و جہد میں گزرے وہ اُس پل سے کہیں بہتر ہے جو تفریحات کی نذر ہو جائے۔ یہاں وطن کے گلی کوچوں، کھیت کھلیانوں، دھول اُڑاتے کچے راستوں اور پگڈنڈیوں کو فراموش کر کے، والدین کی انمول شفقت، بھائی بہنوں کے لاڈ، شریک حیات کی ناز برداری، اولاد کی معصوم ادا اور رفیقوں کی رفاقت سے منہ موڑ کر آنا ایسی مجبوری ہے جو گرانی سے دو بدو ہونے اور ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے لازمی ہو گئی ہے۔

ایک شام یارات کے اوّلین پہر حصول رزق کی خاطر سڑکوں پہ چہل قدمی کرتے ہوئے راوی کو قانونی محافظوں نے یوں نرغے میں لے لیا جیسے بلّی چوہوں پہ جھپٹتی ہے یا چیل انھیں اُچک کر اپنے پنجوں میں دبوچ لیتی

ہے۔ بعدازاں وہ جبراً کار کی پچھلی سیٹ پہ چسپاں کرکے نئے شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔اُن کا ہر نیا شکار خطی رائج الوقت سلطنت کے خزانے میں بھر دیتا ہے۔ شکاری اور شکار لازم وملزوم ہیں جس میں اوّل تعاقب کرتا ہے اور دوم تعاقب کراتے ہوئے راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اوّل جب اپنی کامیابی پر قہقہہ لگا کر جشن مناتا ہے تو دوم اُس لمحہ کو کوستا ہے جب یہ مصیبت گلے پڑی تھی۔ دوم کی کامیابی اوّل کی ناکامی ہے جس پر وہ 'کھسیانی بلّی کھمبا نوچے' کے مصداق اپنا سر پیٹنے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتا۔

کار سے بس میں منتقلی صغیر سے کبیر تک کا سفر رہا۔ ماہ کی اوائل تاریخوں میں جب آسمان گھٹاٹوپ اندھیروں کی ردا اُوڑھے محوخواب تھا، سلطنت کے اراکین بیدار تھے اور مستعدی سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ زندان اوّل میں قرطاس اربعہ کی خانہ پُری کے بعد ہمیں زندان ثانی میں یوں لے جایا گیا جیسے قصاب جانور کو قربان گاہ تک لے جاتا ہے۔ وہ جانا نہیں چاہتا مگر 'زبردست' کی 'زیردست' پر برتری اُسے سرِ تسلیم خم کرنے کے علاوہ دوسرا راستہ نہیں سُجھاتی۔ زنداں بیرکوں میں تقسیم ہوتی ہے جن کی تعداد نصف درجن سے لے کر کئی درجن تک ہوسکتی ہے۔ زندانِ سلطنتِ حیرانیہ سماوات سبعہ کی طرح سات بیرکوں میں تقسیم کی گئی ہے جس میں سے ہر ایک میں چار سے چھ سو نفوس ایک دوجے کے پہلو بہ پہلو وقت کاٹنے کی تکلیف سے دوچار ہونے کے لیے آتے ہیں۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ یہ ناخوشگوار فریضہ بعض حضرات خوشی خوشی اور خطیر رقم دے کر ادا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان کا مقصد روانگی کی سہولت اور اخراجات سے بری الذمہ ہونا ہے جو سفارت خانہ کے کارکنان اپنے فرض سے مجبور ہو کر یا انسانیت کی گنگا میں ہاتھ دھونے کی خاطر کر ہی دیتے ہیں۔

یہاں کی خوراک مریضوں کے لیے بھلے ہی اکسیر کا کام کرے مگر صحت مندوں کو اپنا اسیر بنانے میں ناکام رہتی ہے۔ زنداں میں ملنے والی روٹیاں اُس بوسیدہ کاغذ کی طرح لگتی ہیں جس پر پڑنے والی شکن اسے کئی حصوں میں بانٹ دیتی ہے۔ سبزی میں آلو کم اور شوربہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ بادشاہ سبزی میں اگر حرکت کی قوت آ جائے تو وہ تیراکی کا لطف لینے کا موقع ہرگز نہ گنوائے۔ صبح وشام کا احساس یہاں روزن سے چھن کر آنے والی روشنی سے ہوتا ہے جو بسا اوقات گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے کہ کہیں اُس سے بھی رہائشی اجازت نامہ نہ طلب کرلیا جائے۔ کبھی کبھی وہ بیرک کے محافظوں کی نظروں سے بچتے ہوئے قیدیوں سے آنکھ مچولی کھیل کر اُن کا دل بہلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ تمھاری زندگی کا یہ روشن دن اُس تاریک شب کی مانند ہے جو تھوڑی ہی دیر میں مجھ پہ مسلط ہونے والی ہے۔ یہاں آنے والے افراد کا ایک دوسرے سے صرف آدمیت کا رشتہ ہوتا ہے جو علاقہ، رنگ، نسل، ذات، قوم اور فرقے کے اختلاف کے باوجود چند لمحوں میں یوں شیر وشکر ہو جاتے ہیں جیسے اُن کی برسوں پُرانی ملاقات ہے۔

زنداں میں آنے والے ہند و پاک، بنگلہ دیش اور فلپائن کے باشندوں میں یکسانیت صرف اتنی ہے کہ سبھی کمر توڑ مہنگائی کا مقابلہ کرنے کے لیے اور وطن عزیز میں بے روزگاری کے عفریت سے لڑ کر دیارِ غیر میں پہنچے ہیں۔

چھ سال سے مقیم گورکھپور کے ناظم الدین اور چھ ماہ سے رہائش پذیر محمد طاہر نیز سرسوں کے ساگ، مکئی کی روٹی ولسی کے سحر میں گرفتار بلویندر سنگھ کو وطن کی یاد ہر پل کچوکے دیتی ہے۔ عثمان شیخ کی سزا کا دورانیہ طویل ہے اور وہ یہاں دربان سے ساز باز کر کے عمومی خوراک کے ساتھ ذائقہ زبان کو فروغ دینے کے تمام جتن بھی کر رہا ہے۔ اُسے خبر ہے کہ یہاں سے گھر کی جانب رخت سفر باندھنا ہے جہاں روزگار میں اتنی فراخی شاید ہی ہو سکے۔ اسی لیے وہ اشیاء کی قیمت تین سے پانچ گُنی زیادہ وصول کرتا ہے۔ زنداں کی بے مزہ غذاؤں کے مقابلہ میں یہ مہنگی خوراک زبان کو لذّت دے جاتی ہے یہی کیا کم ہے۔ ایسے کئی نام اور بھی ہیں جو اِن سے قطع نظر قانونی محافظوں کو خطیر رقم کا نذرانہ پیش کر کے یہاں پہنچے ہیں تا کہ جلد از جلد اپنے وطن کی فضاؤں میں جا کر وہاں کے کھیتوں، کھلیانوں کی سوندھی مٹّی کی خوشبو سے مشام جاں کو معطر کر سکیں۔ یہ گنتی کے چند نفوس ہیں جبکہ ایسے حضرات کی تعداد خاصی ہے جو عمر کی تین چار دہائیاں گزارنے کے بعد بھی یہاں سے رخصت ہونے کے خواہاں نہیں۔ وطن میں جا کر گرانی سے دوبدو ہونے کا اُن کا خوف بجا سہی مگر تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی نظر رہے ۔ ہم نشینی کو ترستی شریک حیات اور سرپرستوں کی نظر عنایت سے محروم اولاد کا ازالہ ممکن ہی نہیں۔ در و دیوار سے لپٹا اور باغوں کے جھولوں میں سمٹا ہوا لمحہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے: 'اب تو آجاؤ، ایسا نہ ہو کہ پھر دیر ہو جائے'۔

دہلی سے رنگون منتقل ہو کر جیل کی دیواروں پر اشعار کے گل بوٹے کھلانے کی روایت جو بہادر شاہ ظفر سے منسوب ہے بھلے ہی صد فیصد حقیقت نہ ہو لیکن یہاں کی دیواریں محبوس افراد کے دل کی ترجمانی بخوبی کرتی ہیں۔ 'قسمت سنگھ مینا جیل کے اندر آیا' بظاہر عام سا فقرہ ہے لیکن اس میں مجبوری، درد اور تڑپ کی داستان پوشیدہ ہے۔ یہ دیواریں بہت سی کہانیاں سناتی ہیں جو چند بے معنی الفاظ، اعداد اور اشاروں کناروں کی زبانی سامنے آتی ہیں۔ یہاں آوازوں کے جنگل میں بے فکری سے قہقہے لوگ اچانک ہی اُداس ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ سوچ کر کہ 'دنیا میں کتنا غم ہے، میرا غم کتنا کم ہے' دل کے درد کو سینے سے لگا کر ایک بار پھر خوش گپیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ درد کا یہ اظہار ہوتا رہے تو زخم پہ از خود مرہم لگ جاتا ہے ورنہ سزا کا یہ دورانیہ لمحہ لمحہ نمک پاشی ہی کرتا ہے۔

بظاہر راوی کا یہ بیانیہ وہ عام سی کہانی ہے جو گاہے گاہے اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہتی ہے مگر 'درد کو آپ محسوس بھی کیجئے' کے مرحلہ تک پہنچ کر ذہنی اذیت کی تہہ تک جانا دشوار نہیں رہتا۔ کیا آپ کو میرے خیال سے اتفاق نہیں؟ دل پر ہاتھ رکھیے اور سوچئے، جواب خود ہی مل جائے گا۔

نعتِ رسولؐ

انسانیت نواز رسالت رسول کی
ایک معجزے سے کم نہیں بعثت رسول کی

شرح کلام پاک ہے سیرت رسول
ہے مستند ترین شریعت رسول کی

سچ مچ ہے جن کے دل میں محبت رسول کی
حاصل انہی کو ہوگی شفاعت رسول کی

ذکر رسول آئے تو آنکھیں چھلک پڑیں
ظاہر کچھ اس طرح ہو محبت رسول کی

پتھر برس رہے تھے مگر ظرف دیکھئے
مصروف تھی دعاؤں میں رحمت رسول کی

فکروعمل میں عشق کی تحریک چاہئے
ہوجائے خواب میں ہی زیارت رسول کی

تابندہ، تابناک خیالات دے خدا
تحریر کرنے بیٹھا ہوں مدحت رسول کی

صدیاں گزر گئی ہیں مگر آج بھی نعیم
روشن دل ونظر میں ہے سنت رسول کی

نعیم احمد غازی فلاحی،
نئی دہلی

غزل

جاتے جاتے لوٹ کر آنے کا کچھ امکان دے
اَن کہی میری کہانی ہے، اسے عنوان دے

تیرے جاتے ہی عقیدے میں بگاڑ آنے لگا
میری کافر دھڑکنوں کو دین دے، ایمان دے

بھیگی پلکیں، سرخ آنکھیں، کپکپاتے حرف ولب
میں سفر پر جارہا ہوں، کچھ سروسامان دے

دست قاتل تھک گیا، تو شرط یہ رکھی گئی
نوکِ خنجر مڑگئی ہے، اس کا بھی تاوان دے

تاشکستہ پائی میری دیکھ نہ پائے کوئی
منزلیں آسان کر، یا راستے سنسان دے

کوئے جاناں میں زرِ اخلاص چلتا ہے فقط
جان دینی ہے تو اس کی شان کے شایان دے

نامۂ اعمال میں کیا ہے عقیدت کے سوا
میرے مولی، حشر میں پرچہ ذرا آسان دے

زر پرستوں کی طرف سے حکم یہ نازل ہوا
کوزہ گر کو خاک کردے، چاک کو سمان دے

عشق کرنا ہے تو راشد کل اثاثہ نذر کر
پھر یہ اس پر چھوڑ دے، وہ نفع دے، نقصان دے

سید راشد حامدی فلاحی،
شاہین باغ۔نئی دہلی

فلسطین

اے مورّخ ترے ہاتھ سے چھوٹ کر
دیکھ قدموں میں تیرے قلم گرگیا
جابجا روشنائی بکھر سی گئی
جیسے چھینٹے لہو کے ہوں پھیلے ہوئے

وہ لہو سر زمینِ فلسطیں جسے
اپنے آغوش میں جذب کرتی رہی
وہ لہو آسمانِ فلسطیں جسے
چشمِ حیرت سے مایوس تکتا رہا
وہ لہو جو نہتّے بدن سے بہا
وہ لہو جو کہ بچّوں کے تن سے بہا
وہ لہو ماں کے آنچل پہ جو جم گیا
وہ لہو جس کے بہنے کا کوئی اثر
نسلِ انسانیت پر ہوا ہی نہیں
عہدِ حیوانیت پر ہوا ہی نہیں
اے مورّخ قلم ہاتھ میں پھر اٹھا
جا بجا روشنائی بکھرنے نہ دے
وہ مقدّس لہو جو شہیدوں کا ہے
اس کو مضموں بنا، کوئی عنوان دے
عہدِ حیوانیت کی ڈگر پر نہ جا
اپنی انسانیت آسمانی بنا
اپنی انسانیت جاودانی بنا

عزیز نبیل،قطر

غزل

عزیمت سے جو ہو محروم حقدار ہزیمت ہے
گہر پانے کی پہلی شرط غواصی کی جرأت ہے

ترے آزاد بندوں کو عطا ہو ذوق آزادی
کہ صدیوں سے غلامی آشنا ان کی طبیعت ہے

مقام رشک کیوں کر بے ضمیروں کی ترقی ہو
مقام شکر ہے اپنا ضمیر اب تک سلامت ہے

مرے گھر میں نہ ٹی وی ہے نہ فلمیں ہیں نہ خبریں ہیں
یہ تقوی ہے نہ شکوہ ہے فقط تحدیث نعمت ہے

محبت، درگزر، دریادلی ہے، خیرخواہی ہے
بایں اوصاف، گھر جنت نشاں ہے، کاخ رحمت ہے

دعا ماں باپ کی ہم رہ رہی سب امتحانوں میں
مری ہر کامیابی اس وسیلہ کی بدولت ہے

ذرا سی زندگی میں دشمنی کیا؟ بغض وکینہ کیا
محبت کے تقاضے پورے ہوجائیں غنیمت ہے

محی الدین غازی،
متحدہ عرب امارات

غزل

سوز دروں نے مجھ کو عطا کی ہے زندگی
کس نے کہا کہ عشق نے جینا کیا حرام

پہلا قدم رکھا ہے ابھی رہگزار میں
مجھ سے ہے کیوں فرار تجھے گردش مدام

آتش کدے نے اور بھی بھڑکا دیا ہے شوق
مقتل کی سمت بڑھنے لگا سوز تشنہ کام

اس درجہ حشر خیز ہے اس کا عتاب حسن
سجدے میں گر پڑے ہیں بتان گماں تمام

وارفتگان شوق کی ساری خطا معاف
بزم طرب میں گونج رہی ہے صدائے عام

ق

دھڑکن میں شور بر پا تھا آنکھوں میں انتظار
اب جاکے وحشتوں کو ہے آیا قرار تام

دنیا سمجھ رہی تھی جسے نیشتر زنی
اس نے حیات نو کا دیا جاں فزا پیام

شاکر الاکرم شاکرؔ، ناگپور

9850512694

غزل

زماں مکاں سے بھی کچھ ماورا بنانے میں
میں منہمک ہوں بہت خود کو لا بنانے میں

چراغِ عشق بدن سے لگا تھا کچھ ایسا
میں بجھ کے رہ گیا اس کو ہوا بنانے میں

یہ دل کہ صحبتِ خوباں میں تھا خراب بہت
سو عمر لگ گئی اس کو ذرا بنانے میں

گھری ہے پیاس ہماری ہجومِ آب میں اور
لگا ہے دشت کوئی راستا بنانے

مہک اٹھی ہے مرے چار سو زمینِ ہنر
میں کتنا خوش ہوں تجھے جا بہ جا بنانے میں

سالم سلیم، نئی دہلی

غزل

یہ خاکی پیرہن اک اسم کی بندش میں رہتا ہے
زمانہ ہر گھڑی ورنہ نئی سازش میں رہتا ہے

اسی باعث میں اپنا نصف رکھتا ہوں اندھیرے میں
مرے اطراف بھی سورج کوئی گردش میں رہتا ہے

میں اک پرکار سا سیّار بھی ہوں اور ثابت بھی
جہاں سارا میرے قدموں کی پیمائش میں رہتا ہے

مری آنکھوں میں اب ہے موجزن بس ریت وحشت کی
سمندر اب کہاں پلکوں کی ہر جنبش میں رہتا ہے

میں شاخ ذہن سے پنچھی اڑا دوں سب خیالوں کے
شب ہجراں، مرا بستر اسی کوشش میں رہتا ہے

سپرد آب یوں ہی تو نہیں کرتا ہوں خاک اپنی
عجب مٹی کے گھلنے کا مزہ بارش میں رہتا ہے

تسلط ہے کسی کا جب سے اپنی ذات پر صارمؔ
ہمارا دل بہت آرام وآسائش میں رہتا ہے

ارشد جمال صارمؔ
اندور، بھوپال

غزل

ذرا سی آس جگائے ذرا امنگ بھرے
کوئی تو آئے مری زندگی میں رنگ بھرے

مرے لبوں پہ اجالے کوئی تبسم بھر
مری نگاہ میں جلووں کے جلترنگ بھرے

کبھی تو یوں بھی مری فکر کی ستائش ہو
مرے خیال کی پرچھائیوں میں انگ بھرے

نہ توڑ میری خموشی کہ تجھ کو زخم ملیں
جو پرسکون ہیں دریا وہ ہیں نہنگ بھرے

ابھی جو سوئے ہیں انور اٹھیں گے حشر کے دن
انہیں وہ جام پلائے گئے ہیں بھنگ بھرے

نعمان انور،
جامعہ ہمدرد۔نئی دہلی

تعارف وتبصرہ

فرہنگ کلیات سودا

مصنف: ڈاکٹر محمد نعیم فلاحی

صفحات: ۴۵۶/قیمت: ۵۰۰/روپے

زیر اہتمام: اپلائیڈ بکس، دریا گنج۔نئی دہلی

مبصر : ابوالاعلی سید سبحانی

مرزا محمد رفیع سودا اپنے عہد کے ممتاز اردو شاعر تھے۔سودا نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، اور اپنے منفرد انداز و اسلوب کی وجہ سے اردو شعراء کے درمیان ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔قصیدہ گوئی میں آپ کو امام مانا جاتا ہے، تاہم آپ قصائد کے علاوہ غزل، مرثیہ، ہجو اور مثنوی وغیرہ میں بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔الفاظ کا حسن انتخاب، پختہ اور مضبوط بندشیں، نرالی تشبیہات اور استعاروں کا خوبصورت استعمال، خیال کی نزاکت اور کلام کی تاثیر آپ کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔سودا کا زمانہ چونکہ اردو زبان کے فروغ کا ابتدائی زمانہ ہے، چنانچہ اس پہلو سے بھی اُن کے کلام کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے زبان کو وسعت دینے اور اسے نئی نئی بلندیوں سے آشنا کرانے کا کام کیا ہے، چنانچہ نئے نئے الفاظ تراشنا، معنی خیز تراکیب ایجاد کرنا، ایہام کا خاتمہ کرنا، اور متروکات کا تصور پیش کرنا سودا کے کلام کا امتیازی پہلو ہے۔

ڈاکٹر محمد نعیم فلاحی گورنمنٹ کالج کوٹہ راجستھان میں لکچرر ہیں۔اس سے قبل موصوف کی ترتیب کردہ دو اہم کتابیں ''کنج قفس'' اور ''اعراف'' (ابرار فائق کے شعری مجموعے) منظر عام پر آچکی ہیں۔زیر نظر کتاب 'فرہنگ کلیات سودا' ڈاکٹر نعیم کی پہلی باقاعدہ تحقیقی کاوش ہے، جس میں مرزا محمد رفیع سودا کے کلام میں مستعمل الفاظ، محاورات، تراکیب اور ضرب الامثال کو جمع کیا گیا ہے۔موصوف لکھتے ہیں کہ ''سودا کے کلام کی فرہنگ ترتیب دینا دراصل اس ذخیرۂ الفاظ کو بروئے کار لانا ہے جو اب تک قیاسات اور اندازوں کی مدد سے جانچا جاتا رہا ہے۔اس قادر الکلام شاعر کی فرہنگ کے ذریعہ اس عہد کے روزمرہ الفاظ اور محاوروں کے ساتھ ساتھ اس کی تراکیب، مفرد الفاظ، اردو و فارسی تراکیب اور ان کی نوعیت کو محفوظ و مدون کیا گیا ہے اور اشعار کے حوالے بھی درج کئے گئے ہیں''۔(صفحہ ۹/۸/مقدمہ کتاب)

یہ فرہنگ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مقدمہ ہے جس میں اس فرہنگ کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر گفتگو ہے، جبکہ دوسرا حصہ فرہنگ پر مشتمل ہے۔ فرہنگ میں حروف تہجی کی ترتیب 'مختصر اردو لغت' مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کے مطابق ہے۔ اردو زبان کے شائقین کے لئے، بالخصوص کلام سودا کے تناظر میں یہ ایک اہم اور مفید پیشکش ہے، امید کہ شائقین اس سے مستفید ہوں گے۔

میخانۂ عجم (رباعیات عمر خیام)

ترجمہ: ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی

صفحات: ۱۱۷/ **قیمت**: ۱۵۰/روپے

اشاعت: ۲۰۰۷ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶

مبصر: سعید اختر اعظمی

حکیم عمر خیام نیشاپوری (ولادت ۱۰۳۹ء، وفات ۱۱۳۱ء) سلجوقی عہد کا معروف ایرانی سائنس داں تھا جو رباعیات کے منظر عام پر آنے کے سبب شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ وہ الجبرا میں خود کو ابوالفتح عمر بن ابراہیم الخیالی کہتا تھا اور اشعار میں خیام (خیمہ دوز) تخلص رکھتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے آباء واجداد میں کسی نے یہ پیشہ اختیار کیا ہو۔ اس کی دلیل اس کی رباعی کے ایک مصرعہ ''خیام کہ خیمہ ہائے حکمت می دوخت'' سے مل جاتی ہے جس میں خیموں کی جانب اشارہ ہے۔ شمس الدین محمد بن قیس نے اپنی معجم میں خیام کے اصلاحی معنیٰ 'اوزان و بحور کا ماہر شاعر' کے لیے ہیں۔ خیام نے ابتدا میں عربی میں اشعار کہے۔ بطور نمونہ یہ شعر۔

متی مادنت دنیاک کانت مصیبة　　　فوا عجبا من ذاالقریب المساعد

(جب تیری دنیا تجھ سے قریب ہوگی تو مصیبت بن جائے گی۔ تو اے افسوس اس قریب پر جو دور ہو جانے والا ہے)

یہ فارسی رباعی ملاحظہ کیجیے۔

یک قطرہ آب بود دریا شد　　　یک ذرّہ خاک با زمین یکتا شد
آمد شدنِ تو اندرین عالم چیست　　　آمد مگسی پدید دنا پیدا شد

فٹز جیرالڈ نے ان رباعیوں کا انگریزی ترجمہ کر کے خیام کو بین الاقوامی مقبولیت دلائی۔ رہا اردو میں تراجمِ رباعیاتِ خیام کا سوال تو دکنی شعراء نے اس حوالے سے پہل کی۔ راجہ مکھن لال نے ۱۸۴۲ء میں ترجمہ کیا، تو سید کاظم علی شوکت بلگرامی نے مئے دوآتشہ کے نام سے قارئین کے روبرو کیا۔ دیگر تراجم میں لائق حسین قوی امروہوی (تاج الکلام ۱۹۲۴) واقف مرادآبادی، حنفی لکھنوی (شراباتِ خیام)، کاشی پریاگی، صبا اکبرآبادی (دوست زرفشاں ۱۹۸۵) عبدالحمید عدم (درجام) میراجی، تلوک چند محروم، عرش ملسیانی، منشی رام سہائے تمنا، محمد عبدالحئی فائز اور محشر لکھنوی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ شاگرد داغ آغا شاعر نے خمکدہ خیام کے نام سے جو ترجمہ کیا اس میں رباعی کے مخصوص اوزان

کو برتتے ہوئے تمام تر تخلیقی حسن کو منتقل کر دیا۔ اس حوالے سے تازہ ترین منظوم ترجمہ عادل اسیر دہلوی کا ہے۔

ترجمہ نگاری مشکل ترین فن ہے کیونکہ کسی زبان کی نثر و نظم کو دوسری زبان میں تمام تر لطافتِ بیان کے ساتھ منتقل کرنا کوہکنی ہی ہے۔ نظم میں رباعی مشکل ترین صنف ہے جس کے حوالے سے ظہور منصوری اپنی ایک رباعی میں یوں اشارہ کرتے ہیں۔

سارا منظر دہانی ہوجاتا ہے　　ہر گوشہ نورانی ہوجاتا ہے
ہے چار ہی مصرعوں کا رباعی کا فن　　لیکن پتّا پانی ہوجاتا ہے

ایسے میں رباعی اگر عمر خیام کی ہو تو معاملہ یکسر مختلف ہوجاتا ہے۔ یہ رباعی دیکھیے۔

قرآن کہ مبین کلام خوانند اورا　　گہ گاہ نہ بر دوام خوانند اورا
درخط پیالہ آیتے ہست مقیم　　کاندر ہمہ جا مدام خوانند اورا

(قرآن جسے کلام مبین کہتے ہیں لوگ اسے کبھی کبھی پڑھتے ہیں، ہمیشہ نہیں۔ لیکن شراب کے پیالے میں جو لکیر ہے اس میں ایک آیت ہے جسے لوگ مدام پڑھتے ہیں یا اس کو مدام (شراب) کہتے ہیں)

میخانۂ عجم ڈاکٹر عبدالرشید کے منثور ترجمہ سے آراستہ تفہیم رباعیاتِ خیام کی حالیہ کوشش ہے۔ اس کا اختصاص تخلیقیت اور لفظوں کا حسین دروبست ہے۔ موصوف نے یہ ترجمہ فارسی رباعیات کی بنیاد پر نہیں بلکہ فٹز کے انگریزی ترجمہ کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔ جیرالڈ کے بارے میں یہ عام رائے ہے کہ اس نے خیام کی رباعیوں کا آزاد ترجمہ کیا یا ان کے مجموعی تأثر کو انگریزی زبان میں منتقل کر دیا۔ اِن ہی تاثرات کا اردو قالب زیرِنظر کتاب کی صورت میں ہے۔ چند تراجم حسبِ ذیل ہیں:

میرے آس پاس ایک قطعہ مرغزار پھیلا ہوا ہے---- جو صحرا کو مزروعہ زمین سے الگ کرتا ہے----
جہاں آقا و غلام کے نام کی شناخت شاذ و نادر ہی ہوتی ہے---- ترس آتا ہے سلطان محمود کے تختِ شاہی پر

یہ ۷۵ر رباعیاں جو فٹز کے انگریزی ترجمے کے ساتھ ہیں۔ دوران مطالعہ لفظوں کی آنکھ مچولی کے سبب ذہن ودل کو مفہوم کی بھول بھلیوں میں ایک پل کو گم کر دیتی ہیں۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ شکستہ خاطر کے شاعرا سے اردو کے منظوم قالب میں اُسی رنگ و آہنگ کے ساتھ ڈھال دیتے جو عمر خیام کی رباعیوں کا مزاج رہا ہے۔

دکن میں اردو مثنوی سراج اورنگ آبادی تک

مصنف: ڈاکٹر ملک راشد فیصل فلاحی

صفحات: ۲۳۲ / **قیمت:** ۱۰۰/

ناشر: فرید بک ڈپو نئی دہلی

مبصر: عبدالرحمٰن خالد فلاحی

ڈاکٹر ملک راشد فیصل کی اس کتاب پر موصوف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ یہ اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے۔ اس کے عناوین کچھ اس طرح ہیں: صنف مثنوی، دکن میں مثنوی کے ارتقاء کے اسباب،

دکن میں اردو مثنوی کی تاریخ ارتقاء، دکنی مثنویوں کی خصوصیات، صنف مثنوی کے زوال کے اسباب۔

دکن میں اردو مثنوی کے ارتقاء کے ضمن میں مصنف موصوف لکھتے ہیں: ''بہمنی سلاطین نے دکن کے تمدن کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے اپنی حکمت عملی سے مہاراشٹر، کرناٹک اور تلنگانہ تینوں لسانی علاقوں کو ایک ہی سیاست اور حکومت کے تحت متحد کر لیا، اور باہمی رواداری کو عام کیا۔ انھوں نے باہمی اتحاد، میل جول اور معاشرت وتمدن کو مستحکم کرنے کے لئے مقامی اور دیسی رسم ورواج کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی زبان کی سرپرستی کی جو مختلف طبقوں اور علاقوں کے درمیان ربط وضبط اور معاملات ومعاشرت کا ذریعہ بن سکے۔ اس مقصد کیلئے دکنی یا قدیم اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جس نے مقامی اثرات کو تیزی سے اپنا کر بین الاقوامی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ بہمنوں کی شعروسخن کی سرپرستی اور ادب پروری کی وجہ سے قدیم اردو شاعری کو فروغ ملا۔ بہمنی عہد میں اردو مثنوی نے جنم لیا، اور دھیرے دھیرے عروج حاصل کیا۔'' (صفحہ ۵۲/)

اس کتاب میں دکن میں اردو مثنوی کی تاریخ، اس کا ارتقاء اور اس کے زوال تک مختلف مراحل کا بہترین تجزیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے، امید کہ شائقین اس سے مستفید ہوں گے۔

اردو میں تأثراتی تنقید

مصنف: ڈاکٹر مونس فلاحی

صفحات: ۱۲۴/ **قیمت:** ۱۸۰/روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ نئی دہلی

مبصر: عبدالرحمٰن خالد فلاحی

کلام کے حسن ترتیب کو ''ادب'' کہتے ہیں، یا جو بات زیادہ سے زیادہ بھلے آدمیوں کو بھلی معلوم ہو ''ادب'' ہے۔ ادب نظم ہو یا نثر، تنقید کے بغیر اس میں نکھار ممکن نہیں۔ یہ تاریخی ہو یا جمالیاتی یا تأثراتی ہو، ہر ایک کا اپنا مقام ہے۔ برادر مونس کو 'اردو میں تأثراتی تنقید' کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب کے عناوین کچھ اس طرح ہیں: تأثراتی تنقید کا مفہوم اور طریقۂ کار، اردو میں تأثراتی تنقید کی روایت، آزادی کے بعد اردو میں تأثراتی تنقید، تأثراتی تنقید کی تعین قدر۔

تاثراتی تنقید کیا ہے؟ موصوف لکھتے ہیں کہ ''کسی فن پارے کے مطالعہ سے ذہن پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ردعمل کے طور پر جو بات سامنے آتی ہے وہی تأثراتی تنقید کہلاتی ہے۔ مثلاً فلاں نظم مجھے بہت پسند ہے، کس قدر حسین ودل کش ہے، وہ میرے دل میں عجیب قسم کی لہر پیدا کرتی ہے، یہ لہریں میرے لیے خوشی کا باعث بنتی ہیں۔ ایسی خوشی اور مسرت کے اظہار ہی کو میں اس پر بہترین تنقید سمجھتا ہوں''۔ (صفحہ ۲۳/) مشاعروں میں شعراء کرام کو داد دینے کی روایت بھی تأثراتی تنقید کی ایک شکل ہے۔ آزادی کے بعد جن ناقدین نے اردو میں تأثراتی تنقید لکھنے میں نام پیدا کیا، ان میں نیاز فتح پوری، اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، محمد حسن عسکری اور خورشید الاسلام اہم ہیں۔

آپ کے خطوط

الحمدللہ گزشتہ شمارے سے متعلق قارئین کے تأثرات کافی بڑی تعداد میں موصول ہوئے، البتہ صفحات کی قلت کے سبب جملہ تأثرات کو شامل اشاعت کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ یہاں معذرت کے ساتھ محض چند خطوط کی اشاعت پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ **مدیر)**

مولانا نعیم الدین اصلاحی، شیخ التفسیر والادب جامعۃ الفلاح

''حیات نو'' کا شمارہ اپریل تا جون نظرنواز ہوا، مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ برادر عزیز محی الدین غازی نے میرے مکتوب کو اہمیت دی اور اس پر ایک قیمتی تبصرہ سپرد قلم فرمایا اور اپنے حق میں دلیل کے طور پر ابوفراس حمدانی، ابوالعلاء معری اور بشار بن برد کے اشعار اور قاسم حداد کے نثری نمونے کو پیش فرمایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مذکورہ تینوں شعراء دورِ عباسی کے نہایت ہی نامور اور باکمال شاعر ہیں، مگر قرآن مجید کے کسی لفظ کے معنی کے لیے دور عباسی کے شعراء کے کلام سے استدلال صحیح نہیں، کیونکہ عباسی دور کے شعراء کے سلسلے میں عام خیال یہ ہے کہ انہوں نے بالعموم عربی شاعری کی عام روش اور معروف اسلوب سے انحراف کیا ہے۔ فقہاء کی طرح انہوں نے بھی شعروادب کے معاملے میں ''سماع'' کی بجائے قیاس اور رائے کو ترجیح دی ہے۔ احمد امین نے اس عہد کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: "توسیع اللغة عن طريق القياس والتوسع فی الاشتقاق قياساً" (ظهرالاسلام: ۲/ ۸۹، مطبوعه دارالكتاب العربی، بيروت۔ لبنان)

"وكذلك فعل الشعراء فمنهم من لا يستعمل الكلمة الا اذا ثبتت عنده فی اللغة ومنهم من يجرؤ فيبتكر الكلمة أو يقيسها على غيرها" (ظهرالاسلام: ۸۹/۲)

ابوعلی فارسی اس عہد میں متجددین اور ترقی پسندوں کا میر کارواں تھا، وہ ببانگ دہل کہتا تھا: "ما قيس على كلام العرب فهو من كلام العرب" (ظهرالاسلام: ۹۱/۲) بشار بن برد کے سلسلے میں آتا ہے، "وكل ما يعلم من عيوبه خروجه فی شعره عن الحد المألوف" (تاريخ الأدب العربی: ۱۹۴)

اس کے بہت سے عیوب ونقائص میں اس کی معروف اسلوب سے بغاوت ہے۔ اس قسم کے داغ سے ابوالعلاء المعری کا دامن بھی داغدار ہے۔ تاریخ ادب عربی میں ہے: استخف بقواعد اللغة"، "وتشدد فی اتباع القياس"۔ (تاريخ الادب العربی: ۲۲۵)

جمال الدین ابن ہشام انصاری آٹھویں صدی ہجری کا امام نحو ہے، اس کے سلسلے میں ابن خلدون کا یہ ریمارک بڑا اہم ہے "فما عرفنا بعد سیبویه انحی من ابن هشام"۔ اس نے یقیناً بعض مقامات پر دور عباسی کے شاعر متنبّی کے کلام سے استدلال کیا ہے، مگر ہر مقام پر حاشیے میں بتکرار اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں "وقد ذكر البيت هنا للتمثيل لا للاستشهاد لأن المتنبي مؤلد"، اس طرح کے جملے ۶۹، ۱۰۹، ۱۱۹ وغیرہ پر ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ (مغنی اللبیب عن کتب الأعاریب، مطبوعه دارالتفکیر)

ہندوستانی علماء میں عربی اور فارسی ادبیات میں مہارت کے سلسلے میں علامہ شبلی کا نام بڑا نمایاں ہے، علامہ ادیب کے ساتھ مؤرخ بھی تھے، علامہ عربی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: "عربی شاعری سے مراد اسلام سے ماقبل کی زیادہ سے زیادہ بنی امیہ کے عہد تک، اس کے بعد شاعری عربی نہیں بلکہ عجمی ہے۔ صرف زبان کا فرق ہے جس طرح حکومت برائے نام عباسیہ کی تھی اصل حکمراں فارسی اور ترک تھے" (مقالات شبلی: ۳/ ۵۱)

متنبّی کے سلسلے میں لکھتے ہیں: "متنبّی کے عہد میں عرب کی تمام خصوصیات مٹ چکی تھیں" (مقالات شبلی: ۳/ ۵۱)

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ برادر عزیز نے جن شعراء کے کلام سے استدلال کیا ہے، میرے خیال میں وہ لائق استشہاد نہیں ہے۔ کیونکہ ان شعراء نے "سماع" کے بجائے قیاس کو ترجیح دیا ہے اور انہوں نے بھی وہی غلطی کی ہے جو میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں کی تھی، البتہ میری غلطی ناواقفیت کی بنیاد پر تھی، اور ان شعراء کی غلطی میں ناواقفیت نہیں بلکہ بغاوت کا عنصر شامل ہے۔

موصوف نے نثری نمونے کے طور پر قاسم حداد کی تحریر پیش کی ہے، یہ کس عہد کے ہیں؟ معلوم نہیں۔ مجھے شبہہ ہوتا ہے شائد موصوف نے اپنے کسی ساتھی کا کلام پیش کر دیا ہو، یا اپنے کسی معاصر کا۔ اگر ایسا ہے تو اس پر تبصرہ کرنے کے موقف میں اپنے آپ کو نہیں پاتا، واللہ اعلم بالصواب۔

<u>**محمد اسماعیل فلاحی**، شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح</u>

تازہ شمارے کا اداریہ پیش نظر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم اور خدمت خلق کے میدان میں عیسائی مشنریاں بہت آگے ہیں۔ دور دراز، سہولیات سے محروم کسی بھی دیہات میں ان کے نوجوانوں کو بھیج دیا جاتا ہے، اور وہ اپنی زندگیاں اپنے مقصد کے لیے لگا دیتے ہیں۔ جس سفر کا اداریے میں ذکر کیا گیا ہے، اس میں عیسائی مشنری سے تعلق رکھنے والے گورکھا لینڈ کے ایک نوجوان اور دو لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے ہمارے سامنے اپنے حسن کردار کا ثبوت پیش کیا، اپنی ریزرو سیٹ پر ہمیں اور دوسروں کو بیٹھنے دیا۔ یاد ہوگا، ہمارے سامنے کی سیٹ پر نہایت خستہ حال، معذور، کمزور اور بیمار ایک مسلمان صاحب بیٹھے تھے۔ یہ دونوں لڑکیاں راستے بھر ان کا خیال رکھتی اور مدد کرتی رہیں۔ وہ منظر بھی یاد ہوگا کہ جب کچھ لوکل لوگ ایک اسٹیشن پر سوار ہو کر، اجڈ انداز میں، زبردستی ان کی سیٹ پر بیٹھنے لگے تو ان لڑکیوں نے کس جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کیا، اور ان سے ذرا بھی نہیں ڈریں۔

کئی شماروں سے سورہ حدید کی آیت 'ما أصاب من مصيبة' کے تعلق سے مختلف فضلاء کے درمیان جو علمی گفتگو

چل رہی ہے، وہ قابل تحسین ہے۔محترم نسیم غازی فلاحی صاحب کا انداز نہایت شائستہ تھا۔ پھر مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے سلجھے انداز میں ایک دوسرے کے وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے علمی گفتگو کی، اس کے بعد مولانا نعیم الدین اصلاحی کے نقد پر جس فراخ دلی اور خندہ جبینی کے ساتھ محترم نسیم غازی صاحب کا تأثر سامنے آیا، وہ قابل ستائش ہے۔حقیقت یہ ہے کہ علمی پرچوں اور سیمیناروں کی یہی روح ہے جو اٹھتی جارہی ہے۔ عام طور سے لوگوں کے اندر اپنے سے مختلف نقطۂ نظر رکھنے والوں کی بات سننے اور برداشت کرنے کا حوصلہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ضرورت ہے کہ اس علمی فضا کو وسعت قلب ونظر کے ساتھ پھر زندہ کیا جائے۔

عزیز مکرم محی الدین غازی صاحب نے اس علمی بحث کو آگے بڑھایا ہے۔لفظ مصیب اور مصیبۃ کے مزید معنی اور اس کی اصل بتانے کی کوشش کی ہے، جو بالکل بجا ہے۔ان کی گفتگو سے یہ بات عیاں ہے کہ زیر بحث آیت کے سلسلے میں انہیں مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب کے موقف سے اختلاف نہیں ہے۔

ڈاکٹر محی الدین غازی، متحدہ عرب امارات

گذشتہ شمارہ میں لفظ مصیبۃ کے سلسلے میں راقم نے ایک مراسلہ لکھا تھا، جس میں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ یہ لفظ زیادہ تر بطور اسم آفت ومصیبت کے لئے استعمال ہوتا ہے، البتہ کبھی بطور وصف یا اسم فاعل بھی آتا ہے، اور اس وقت وہ فعل أصاب کا مفہوم ادا کرتا ہے، ایسا اسم فاعل مذکر کے ساتھ تو ہمیشہ ہوتا ہے، کیونکہ اسم فاعل مذکر بطور اسم کسی اور مفہوم کے لئے استعمال نہیں ہوتا، تاہم اسم فاعل مونث کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے مگر نسبتا کم۔مثال میں مختلف ادوار کے کلام سے مثالیں بھی دی گئی تھیں، جن میں قدیم ترین مثال بشار بن برد کا شعر تھا۔بشار بن برد کی وفات ۱۶۸ ہجری میں ہوئی، جبکہ ابراہیم بن ہرمہ کی وفات ۱۷۶ ہجری میں ہوئی، موخر الذکر کے بارے میں اصمعی کا مشہور زمانہ قول ہے کہ ختم الشعر بابراهيم بن هرمه۔غرض یہی وہ زمانہ تھا جب اشعار سے استشہاد کا دروازہ بند ہورہا تھا۔اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ نحو کے امام سیبویہ نے بھی بشار بن برد کے اشعار سے استشہاد کیا ہے۔واضح رہے کہ متنبّی (ت ۳۵۴ھ) کا زمانہ بشار سے تقریبا دوصدی بعد کا ہے۔

اس مراسلہ کو لکھنے کا محرک یہ بنا، کہ حال ہی میں دوران مطالعہ جاہلی دور کا ایک شعر نظر سے گزرا جس میں لفظ مصیبۃ آفت ومصیبت کے بجائے بطور اسم وصف استعمال کیا گیا، مناسب سمجھا کہ قارئین کی خدمت میں اسے پیش کیا جائے تاکہ زیر بحث موضوع میں اس سے مدد لی جاسکے۔شعر اس طرح ہے:

أعاذل قد أطنبت غير مصيبة

فان كنت في غي فنفسك فارشدي

ترجمہ: مجھے ملامت کرنے والی تیری ملامت کا سلسلہ دراز ہوگیا، جبکہ تو برحق نہیں ہے، اس لئے اگر تو گمراہی میں مبتلا ہے تو پھر خود کو راہ راست پر لا۔

اس شعر میں مصیبۃ کا مطلب آفت ومصیبت نہیں ہے بلکہ کہی ہوئی بات میں برحق ہونا ہے۔

یہ شعر جاہلی دور کے مشہور شاعر عدی بن زید العبادی کے مشہور قصیدہ أتعرف رسم الدار من أم معبد کا ہے۔ عدی بن زید کے دیوان میں صفحہ ۱۰۲ پر اسے دیکھا جاسکتا ہے جو محمد جبار المعیبد کی تحقیق کے ساتھ دار الجمھوریہ بغداد سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس شعر کو محمد بن داود الأصبہانی (ت ۲۹۷ھ) نے اپنی کتاب الزھرۃ میں عدی بن زید کی طرف منسوب کرکے ذکر کیا ہے، اور اسی حوالے سے دیوان میں شامل کیا گیا ہے۔

راقم ایک بار پھر استاذ محترم مولانا نعیم الدین اصلاحی کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہے کہ تحقیق کا جو بھی ذوق وشوق حاصل ہوسکا ہے اس میں آپ کی خصوصی توجہ کا خاص کردار رہا ہے۔

ڈاکٹر سلیم خان، (معروف سیاسی تجزیہ نگار، حال مقیم متحدہ عرب امارات)

شمارہ بھیجنے کا شکریہ۔ جزاک اللہ خیر الجزاء۔ آپ کا اداریہ نظر نواز ہوا، اور جو بات پسند آئی وہ مشنری اسکولوں کی خدمات کا اعتراف ہے۔ اس لئے کہ اگر حقائق کا اعتراف نہ کیا جائے تو ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، ہاں منکر کا نقصان ضرور ہوتا ہے۔

میں مشنری کے تبلیغ دین کا حق تسلیم کرتا ہوں اور ان کی کوششوں کو سراہنے میں کسی بخیلی کا قائل نہیں ہوں۔ ان کی قربانیاں یقیناً قابل ستائش ہیں۔ مشنری اسکولوں نے معیاری تعلیم کے فروغ میں جو کردار ادا کیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے ساتھ ایک سنجیدہ مسئلہ بھی منسلک ہے جس کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔

مشنری اسکول میں کوئی خاص عقیدہ تھوپا نہیں جاتا لیکن اس کے طلبہ دورانِ تعلیم مغربی اقدار سے بے حد مرعوب ہوجاتے ہیں۔ مغرب کے مذہبی اور غیر مذہبی دونوں طبقات دین ودنیا کی تفریق کے قائل ہیں۔ وہ لوگ دین کے سیاست میں عمل دخل کو سمِ قاتل سمجھتے ہیں اور یہ بات مشنری اسکول کے ہر طالب علم کے قلب وذہن میں پیوست ہوتی ہے الا ماشاء اللہ۔ جب یہ ہونہار طالب علم عملی دنیا میں آتے ہیں تو انہیں اسلام کی سیاسی تعلیمات بے حد کھلتی ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کا دائرۂ کار عقائد وعبادت سے آگے نہ بڑھے۔ اس طرح کی خواہش مسلمان اور غیر مسلم دونوں طلبہ کی ہوتی ہے، یہ مسئلہ قومی سطح پر ہے اور عالمی سطح پر بھی۔ عالم اسلام میں تحریک اسلامی کی مخالفت سیاسی اسلام کے نام پر ہوتی ہے اور ایک دبنگ تعلیم یافتہ گروہ اس کام پر کمر بستہ ہے۔ ان لوگوں کی فکری تربیت مشنری اسکولوں میں ہوئی ہے۔ اسکول کے اندر ایک زہریلا بیج نرم مٹی میں دانستہ یا نادانستہ طور پر ڈال دیا جاتا ہے اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس نظام تعلیم کے پروردہ اس بیج کی نشوونما کے لئے کھاد پانی کی فراہمی کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح گویا اسلامی تحریک کی بیخ کنی کا کام کیا جاتا ہے۔ اس لئے مشنری اسکول کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعہ برپا ہونے والے فساد کا استحضار بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر اس کا توڑ ممکن نہیں ہے۔

پھر ایک بار ایک اچھا شمارہ نکالنے کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں۔ اللہ رب العزت آپ کی سعی کو بارآور فرمائے۔

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبۂ اعلیٰ، جامعۃ الفلاح

ڈاکٹر آفاق خان کا لکچر

۹/جون بروز دوشنبہ بعد نماز عصر جامعہ کی مسجد میں ڈاکٹر آفاق ندیم خان (چھتے پور، اعظم گڑھ) کا ایک توسیعی لکچر ہوا۔ آپ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بھوپال سینٹر میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ پوروانچل یونیورسٹی، اتر پردیش ٹیکنیکل یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ آپ نے طلبہ کو محنت کرنے پر ابھارا، انہوں نے کہا کہ مستقبل آپ کا منتظر ہے۔ اسی طرح انہوں نے بتایا کہ طلبہ کے لیے آئندہ زندگی میں آگے بڑھنے کے کیا کیا مواقع ہیں؟ اور سماج میں کیسی خدمات وہ انجام دے سکتے ہیں۔

جامعہ میں سالانہ امتحان اور تعطیل کلاں

جامعہ کے تعلیمی کلینڈر کے مطابق تعلیم ۲۵/مئی ۲۰۱۴ء تک جاری رہی۔ ۲۸/مئی ۲۰۱۴ء بروز چہارشنبہ کو سالانہ امتحان کا آغاز ہوا، یہ امتحان ۱۶/جون ۲۰۱۴ء بروز یکشنبہ تک جاری رہے۔ اعلانِ نتائج ۲۳/جون ۲۰۱۴ء بروز یکشنبہ کو ہوا، تمام ہی طلبہ امتحان کے بعد اپنے اپنے وطن کے لیے روانہ ہوگئے۔

الوداعی تقریب

۱۴/جون ۲۰۱۴ء بروز شنبہ فضیلت کے طلبہ کی ایک الوداعی تقریب منعقد ہوئی جس میں تمام اساتذہ کرام نے شرکت کی۔ فضیلت سے فارغ ہونے والے تمام طلبہ نے اپنے عزائم اور احساسات وتأثرات کا اظہار کیا۔ آخر میں ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے کہا کہ کسی بھی ادارہ کا تعارف طلبہ ہوتے ہیں، ادارہ کے سفیر ومبلغ بھی طلبہ ہی ہوتے ہیں، طلبہ کو دیکھ کر لوگ ادارہ کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں، اس لیے حسنِ اخلاق اور قربانی سے آپ کی زندگی عبارت ہونی چاہئے۔ مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب کی دعا پر پروگرام اختتام پذیر ہوا، اس سال فضیلت سے فارغ ہونے والے طلبہ کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

(۱) محمد اکمل فلاحی دربھنگہ، بہار (۲) فرحان اجمل فلاحی، بجنور (۳) اسامہ عظیم فلاحی، اعظم گڑھ (۴)

عبدالقوی عادل فلاحی، اعظم گڑھ (۵) عبدالماجد فلاحی، اعظم گڑھ (۶) شکیل احمد خان فلاحی، اعظم گڑھ (۷) امجد علی فلاحی، سوپول، بہار (۸) نصیر احمد فلاحی، کشمیر (۹) نعیم حسن فلاحی، کشمیر (۱۰) زبیر احمد فلاحی، نیپال (۱۱) محمد ایوب فلاحی، کشمیر (۱۲) محمد عاشق فلاحی، رانچی، جھارکھنڈ (۱۳) شفیع اللہ فلاحی، سدھارتھ نگر، یوپی (۱۴) محمد ریاض فلاحی، کشمیر (۱۵) محمد مدثر فلاحی، الہ آباد (۱۶) وسیم احمد فلاحی، اعظم گڑھ

جمعیۃ الطلبہ کے نئے انتخابات

۲ر ستمبر بروز منگل بمقام ابواللیث ہال مہتمم تعلیم وتربیت کی نگرانی میں سال رواں کے لیے جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح کا انتخاب عمل میں آیا، ذمہ داران کے نام کچھ اس طرح ہیں:

سکریٹری:	یاسر احمد خان، کریم نگر۔ تلنگانہ
لائبریرین وانچارج رسائل وجرائد:	نجم الحق کانپوری
معتمد تحریر وخطابت:	عمار احسن لکھنوی
معتمد گیم وباغبانی:	عامر جاوید، کلکتہ

نئے تعلیمی سال کا آغاز

۹ر اگست ۲۰۱۴ء بروز شنبہ کو نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا ضمنی امتحانات ۱۰ر اگست ۲۰۱۴ء تا ۱۷ر اگست ۲۰۱۴ء بروز یکشنبہ تک جاری رہے۔ ۱۰ر اگست سے داخلہ وتجدید داخلہ کی کاروائی شروع ہوئی۔ ۱۹ر اگست ۲۰۱۴ء بروز شنبہ سے تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہو چکا ہے۔

اس سال جامعہ میں ۱۲ر اگست ۲۰۱۴ء بروز سہ شنبہ نئے طلبہ وطالبات کا داخلہ ٹیسٹ ہوا جس میں ۹۶ر طلبہ اور ۱۱۵ر طالبات نے کامیابی حاصل کی۔ سہولت کی خاطر دوسرے داخلہ ٹیسٹ کا اعلان فوری طور پر پانچ سو روپے لیٹ فیس کے ساتھ ۱۷ر اگست بروز یکشنبہ ہوا، جس میں ۲۸ر طلبہ اور ۳۵ر طالبات نے کامیابی حاصل کی۔

جامعہ میں نئی تقرریاں

ماہ اگست ۲۰۱۴ء میں جامعہ میں چند معلمین ومعلمات کی تقرری عمل میں آئی، جن کی فہرست درج ذیل ہے۔:

(۱) جناب خان عبداللہ صاحب	شعبہ اعلیٰ	انگریزی
(۲) جناب بدرالدین صاحب	” ثانوی	ریاضی
(۳) محترمہ روبینہ ذوالفقار صاحبہ	”	فارسی
(۴) محترمہ عائشہ عبدالودود صاحبہ	”	ریاضی
(۵) محترمہ نوریزداں عبدالودود صاحبہ	”	”
(۶) محترمہ ام سلمیٰ بنت امام الدین	”	حفظ، قرأت وتجوید

اللہ تعالیٰ تمام ہی نو واردین کو اپنی ذمہ داری بحسن خوبی انجام دینے کی توفیق عنایت فرمائے، آمین۔

اساتذہ کی ایک اہم نشست

۱۸/اگست ۲۰۱۴ء بروز دوشنبہ معلمین ومعلمات جامعہ کی ایک نشست ابواللیث ہال میں مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مولانا نعیم الدین اصلاحی نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم سب انبیائی مشن سے وابستہ ہیں ہم تدریس کو عبادت سمجھیں۔ ''معلمین کے اوصاف'' پر مولانا عبدالعظیم فلاحی نے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ استاد طلبہ کو صحیح فکر دیتے ہیں اور طلبہ سونے کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ مولانا اعجاز احمد قاسمی نے ''طلبہ کو نظم وضبط کا کیسے پابند بنائیں'' کے عنوان پر گفتگو کی اور فرمایا کہ طلبہ کو مطالعہ کا شوقین بنایا جائے اور وقتاً فوقتاً نظم وضبط سے آگاہ کیا جائے۔ ڈاکٹر محمد عارف نے کہا کہ معلم کا مشن بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ صدارتی خطاب میں مہتمم جامعہ نے کہا کہ طلبہ میں قرآن وسنت کا گہرا علم پیدا کریں اور فقہی بصیرت پیدا کریں اپنی اولاد سمجھ کر انہیں صحیح تعلیم دیں اور ان کی تربیت کریں۔ مولانا عمران فلاحی کی دعا پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

جامعہ میں پانچ روزہ تربیتی کیمپ

گزشتہ سالوں کی طرح امسال بھی جامعہ میں طلبہ کا پانچ روزہ ایک تربیتی پروگرام منعقد ہوا۔ اس پروگرام میں فضیلت کے ۴۴/طلبہ اور عالمیت کے ۱۵/طلبہ کے علاوہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعہ اسلامیہ تلکھنا اور جامعہ مصباح العلوم چوکونیاں کے ۲/۲/طلبہ نے نمائندگی کی۔ مجموعی طور پر شرکاء کی تعداد ۶۵/رہی۔ اس پروگرام میں مختلف شرعی، دینی اور تحقیقی موضوعات کے علاوہ حالات حاضرہ پر کل ۱۹/محاضرے ہوئے۔ ۱۸/اگست ۲۰۱۴ء بروز دوشنبہ افتتاحی سیشن میں جناب شاہد کریم اللہ فلاحی ندوی نے پروگرام کی اہمیت، مقاصد اور فوائد پر بہت ہی جامع انداز میں گفتگو کی۔ پروگرام میں شریک طلبہ کے تعارف کے بعد ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی نے صدارتی کلمات میں طلبہ کو محنت کرنے اور کسی ایک میدان میں اختصاص پیدا کرنے کی تلقین کی۔ ۱۹/اگست ۲۰۱۴ء بروز سہ شنبہ کو درج ذیل پروگرام ہوئے۔

(۱) درس قرآن بعد نماز فجر ـــــ مولانا احسان الحق فلاحی
(۲) مبادی تدبر قرآن ـــــ مولانا نعیم الدین اصلاحی
(۳) قرآن اور سائنس ـــــ مولانا ذکی الرحمان غازی
(۴) مقارنہ ادیان، اہمیت وضرورت ـــــ مولانا انیس احمد فلاحی
(۵) فقہی اختلافات، اسباب وآداب ـــــ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی
(۶) مذہبی تعصب، حقیقت واثرات ـــــ مولانا محمد طاہر مدنی

(۷) تدوین حدیث اور مراحل۔۔۔۔۔۔مولانا محمد شاہد کریم اللہ فلاحی

۲۰؍اگست بروز چہارشنبہ کو درج ذیل عنوانات پر پروگرام ہوئے۔

(۱) بعد نماز فجر درس حدیث۔۔۔۔۔۔مولانا محمد اکمل فلاحی

(۲) حیات طیبہ کا دعوتی پہلو اور مسلمانان ہند کا مطلوبہ کردار۔۔۔۔۔۔مولانا عمر اسلم اصلاحی

(۳) اجتہاد کی حقیقت واہمیت۔۔۔۔۔۔مولانا اعجاز احمد قاسمی

(۴) عالم اسلام کی موجودہ صورتحال، مسائل اور امکانات۔۔۔۔۔۔مولانا نظام الدین اصلاحی

(۵) مقاصد شریعت اہمیت وضرورت۔۔۔۔۔۔مولانا اخلاق احمد کریمی قاسمی

(۶) دعوت دین اور اس کا طریقہ کار۔۔۔۔۔۔محمد دانش فلاحی

(۷) دین میں ترجیحات کا مسئلہ۔۔۔۔۔۔ابوالاعلیٰ سید سبحانی

۲۱؍اگست بروز پنجشنبہ بعد نماز فجر مولانا ذکی الرحمان غازی نے سورہ عادیات کا درس پیش کیا، اس کے بعد اساتذہ کرام کا تربیتی پروگرام شروع ہوا۔ ۲۱؍اگست ۲۰۱۴ء بروز پنجشنبہ کو درج ذیل موضوعات پر لکچر ہوئے۔:

(۱) امتحان کے پرچے معیاری کیسے ہوں۔۔۔۔۔۔مولانا اظہار احمد فلاحی

(۲) درس کی تیاری کیسے کریں؟۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر افضال احمد فلاحی

(۳) کلاس میں نظم ونسق۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر ابوشحمہ صاحب

(۴) تدریس قرآن کا بہترین طریقہ۔۔۔۔۔۔مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی

(۵) تدریس حدیث کا بہترین طریقہ۔۔۔۔۔۔مولانا انیس احمد فلاحی مدنی

(۶) تدریس فقہ کا بہترین طریقہ۔۔۔۔۔۔مولانا محمد طاہر مدنی

بعد نماز مغرب طلبہ کے مابین، اسلامی انقلاب کا طریقہ کار کے عنوان پر ایک پینل ڈسکشن ہوا، جس میں طلبہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۲۲؍اگست ۲۰۱۴ء بروز جمعہ بعد نماز فجر مولانا محمد عمران فلاحی نے درس حدیث پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم دین میں گہرائی پیدا کریں۔ آخری سیشن کی صدارت مولانا رحمت اللہ اثری نے کی۔ ۱۳؍طلبہ نے تأثرات پیش کئے۔ محاضرین میں مولانا ذکی الرحمٰن غازی، مولانا محمد اکمل فلاحی اور مولانا ابوزید فلاحی نے تأثرات پیش کئے۔ اس کے بعد مہمان خصوصی جناب مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی نے ''معاشرے میں طلبہ کی ذمہ داریاں'' کے موضوع پر بہت ہی وقیع خطبہ پیش کیا، اور نہایت ہی مؤثر انداز میں طلبہ کی ذمہ داریوں کو یاد دلایا۔ کلمۂ تشکر جناب مولانا جاوید سلطان خاں فلاحی نے پیش کیا۔ صدارتی کلمات میں مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی نے فرمایا کہ طلبہ محنت اور جدوجہد جاری رکھیں اور اپنے علم میں گہرائی پیدا کریں۔ کیمپ میں شریک تمام ہی طلبہ کو انعامات واسناد سے نوازا گیا۔

یونٹس کے انتخابات

بلریاگنج یونٹ: ۴؍ستمبر ۲۰۱۴ء انجمن طلبہ قدیم بلریا گنج یونٹ کے ممبران کی نشست رکھی گئی، مرکزی انجمن کی جانب سے مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی رکن شوری نے نشست کی صدارت فرمائی۔ اس موقع سے یونٹ کی رپورٹ پیش ہوئی، جائزہ لیا گیا، اور سال رواں کے لیے صدر یونٹ کا انتخاب عمل میں آیا، بعدازاں صدر یونٹ نے اپنی ٹیم کا اعلان فرمایا، اس طرح بلریا گنج کے نئے ذمہ داران کے نام کچھ اس طرح ہیں:

صدر یونٹ: شیر افگن فلاحی

سکریٹری یونٹ: فرحان افضل فلاحی

خازن: طارق مشتاق فلاحی

فلاح یونٹ: یکم ستمبر ۲۰۱۴ء کو انجمن طلبہ قدیم فلاح یونٹ کے ممبران کی نشست سکریٹری انجمن جناب مولانا ضمیر الحسن خاں فلاحی کی صدارت میں رکھی گئی۔ یونٹ کے جائزہ اور احتساب کے ساتھ سال رواں کے لیے مولانا انیس احمد فلاحی کا بحیثیت صدر یونٹ انتخاب عمل میں آیا۔ موصوف جلد ہی اپنی ٹیم کے اعلان کے ساتھ کام کا آغاز کردیں گے۔

انجمن کی ایک اہم پیش رفت

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح نے ابتدا سے جامعہ کے معیار تعلیم کو بڑھانے اور وہاں کے انتظامی امور کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے طلبہ کے ساتھ ساتھ طالبات کے سیکشن پر بھی بھرپور توجہ دی ہے۔ گزشتہ سال بسوں کی خریداری کے سلسلے میں بھی انجمن نے بھرپور تعاون کیا تھا۔ امسال کلیۃ البنات میں تعلیم گاہ کی بالائی منزل کے باقی دو حصوں کی تعمیر کا پروجیکٹ بھی انجمن کی جانب سے شروع کیا گیا ہے۔ جس میں ایک بڑے لکچر ہال کی تعمیر کے ساتھ ساتھ کلاس رومس کی تعمیر بھی پیش نظر رہے۔

اس ضمن میں ۳۱؍اگست کو کلیۃ البنات میں سنگ بنیاد کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ استاذ الاساتذہ جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب حفظہ اللہ ورعاہ نے نئی تعمیرات کا سنگ بنیاد رکھا۔

اس موقع پر جامعہ کے بزرگ استاذ جناب مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب حفظہ اللہ، ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب، صدر انجمن جناب رضوان رفیقی فلاحی صاحب، نائب صدر جناب مولانا انعام اللہ فلاحی صاحب، سکریٹری انجمن جناب مولانا ضمیر الحسن خاں فلاحی صاحب، اور سابق صدر انجمن جناب ڈاکٹر ملک محمد فیصل صاحب اور دیگر ذمہ داران بھی شریک رہے۔

دہلی اور علی گڑھ یونٹ میں افطار پارٹی

ہر سال کی طرح امسال بھی دہلی اور علی گڑھ یونٹ میں انجمن طلبہ قدیم کی جانب سے افطار پارٹی کا نظم کیا گیا، جس میں فلاحی برادران کی ایک اچھی تعداد شریک ہوئی۔ دہلی میں منعقد افطار پارٹی کو نائب صدر انجمن جناب مولانا انعام اللہ فلاحی صاحب نے خطاب کیا۔ اس موقع پر صدر انجمن جناب مولانا رضوان احمد رفیق فلاحی اور دیگر ذمہ داران انجمن بھی موجود تھے۔

حیات نو کا فیس بک پیج

'حیات نو' میں گزشتہ ایک سال سے نمایاں تبدیلیاں لانے کی کوشش جاری ہے، جس میں مشمولات اور مستقل کالمس کا اضافہ ایک اہم کوشش رہی، اللہ کا شکر ہے اس میں کافی حد تک کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ حیات نو کا خصوصی کالم 'فکر و آگہی' کافی مقبول ہوا۔ دوسرا مستقل کالم 'ہمارے زمانے کا جامعہ' بھی کافی پسند کیا گیا۔ اس کے علاوہ مولانا نسیم احمد غازی فلاحی صاحب کا مستقل کالم 'تجربات و مشاہدات' اور ڈاکٹر محی الدین غازی کا مستقل کالم 'تراجم قرآن پر ایک نظر' کے علاوہ دیگر مستقل کالمس بھی شوق کے ہاتھوں لئے گئے۔ اس دوران مجلس ادارت میں بھی نمایاں تبدیلی ہوئی۔ فلاحی برادران کے تعاون سے اس کو انجمن کا واقعی ترجمان بنانے میں کامیابی ملی۔ الحمد للہ ماہ اگست کے پہلے ہفتے میں حیات نو کا فیس بک پیج بھی شروع کر دیا گیا۔ ان شاء اللہ جلد ہی انجمن کی ویب سائٹ پر اس کے قدیم و جدید شماروں کو مستقل طور سے شائع کرنے کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔ فیس بک پر حیات نو کے مضامین کا مطالعہ کرنے کے لیے Hayat-e-nau لکھ کر سرچ کریں۔

علی گڑھ میں جاوید احسن فلاحی کی یاد میں تعزیتی نشست

ڈاکٹر جاوید احسن فلاحی صاحب کی ۱۴ر جولائی کو حرکتِ قلب رک جانے کے سبب اچانک موت سے انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح اپنے ایک علم دوست رفیق سے محروم ہوگئی۔ ان کی موت پر تعزیتی نشستوں کا سلسلہ جاری ہے۔ جماعت اسلامی اے ایم یو ایریا اور انجمن طلبہ قدیم کی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یونٹ کی ایک مشترکہ نشست ۱۸ر جولائی کو ادارہ تحقیق و تصنیف کے کیمپس میں واقع جماعت اسلامی کے آفس میں منعقد ہوئی۔

صدر یونٹ ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی نے کہا کہ جاوید فلاحی صاحب علم و ادب کے جویا تھے، انھوں نے عمر کے اس حصے میں شعبہ تھیالوجی اے ایم یو میں پی ایچ ڈی کا مقالہ جمع کر کے علم دوستی کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے فن تفسیر میں اسرائیلی روایات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

مولانا محمد اسماعیل فلاحی شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح نے ڈاکٹر احسن کی طالب علمی کے دور کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہزاروں فلاحیوں میں اپنے علم اور تبحر کی بنا پر طاق تھے۔ اقرباء پروری اور پڑوسیوں کا خیال کرنے

والے تھے۔ بیماریوں میں گھرے ہونے کے کے باوجود انھوں نے اپنے صالح بچوں کے تعاون سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے ایک مثال قائم کی۔ ان کے بچوں نے باخبر کیا کہ ان کی ڈائری میں رقم ہے کہ ان کی خواہش تھی کہ چلتے پھرتے موت واقع ہو اور رمضان المبارک میں بارگاہِ ایزدی میں حاضری کا شرف حاصل ہو۔ اللہ تعالی نے ان کی دعا قبول فرمائی۔

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی امیر مقامی اے ایم یو ایریا نے کہا کہ جاوید احسن فلاحی نے مولانا امین اثری کے بعد شہر علی گڑھ میں علم کی اعلی روایت کو جاری کیا۔ دروس قرآن کے حلقے کو دس سالوں سے زائد عرصے سے قائم رکھا انھیں شعر وشاعری کا اعلی ذوق تھا۔ امیر مقامی نے مزید کہا کہ جماعت کے رکن نہ ہو کر بھی اجتماعات میں وہ عمدہ اور علمی پروگرام پیش کرتے اور متنازع معاملات میں جماعت کے فیصلوں کا احترام کرنے والے تھے اللہ تعالی انھیں اعلی علیین میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مرکزی انجمن اور ادارہ حیات نو کی جانب سے تعزیتی نشست

جناب مولانا طارق فارقلیط صاحب فلاحی جامعہ کے ممتاز اور نمایاں فارغین میں سے تھے، جامعہ سے ہمیشہ ہی ان کا گہرا ربط رہا۔ انجمن کی بھی بعض اہم اور کلیدی ذمہ داریاں آپ کو دی گئیں، حیات نو کی ادارت کے علاوہ آپ انجمن کی مجلس شوری کے بھی رکن رہے۔ ایس آئی او آف انڈیا اور جماعت اسلامی ہند کے بھی بعض اہم اور کلیدی مناصب پر فائز رہے۔ رمضان کے آخری عشرے میں ۲۸ر جولائی کو حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب آپ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کی رحلت پر مرکزی انجمن طلبہ قدیم اور ادارہ حیات نو کی جانب سے مرکز جماعت اسلامی ہند نئی دہلی میں ایک مشترکہ تعزیتی نشست رکھی گئی، جس کی صدارت جناب مولانا نصرت علی صاحب جنرل سکریٹری جماعت اسلامی ہند نے فرمائی، جبکہ استاذ الاساتذہ ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ اس موقع پر مولانا ابوالمکارم فلاحی ازہری، مولانا انعام اللہ فلاحی نائب صدر انجمن، جناب محمد عارف فلاحی ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی، جناب محمد احمد صاحب سکریٹری جماعت اسلامی ہند، وغیرہم نے موصوف کے ساتھ اپنے تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے موصوف کی حیات کے اہم گوشوں پر گفتگو کی۔

ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی نے اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ میرے بہت ہی خاص شاگردوں میں سے تھے، زمانہ طالب علمی سے ان کے اندر علم کے لیے جستجو اور لگن پائی جاتی تھی، ان کے نام میں فارقلیط کا اضافہ بھی میرا ہی کیا ہوا تھا، وہ جماعت کی مختلف ذمہ داریوں پر رہے، لیکن ہمارا اور ان کا استاذ شاگرد کا رشتہ تادم زیست باقی رہا، اللہ ان کی مغفرت اور جنت میں اعلی مقام سے نوازے''۔

صدارتی خطاب کرتے ہوئے جناب نصرت علی صاحب نے فرمایا کہ ان کا اور ہمارا ساتھ ایس آئی او کے زمانے سے تھا، وہ بہت ہی سوچنے سمجھنے والے اور دھن کے پکے آدمی تھی، اللہ مغفرت فرمائے، یقیناً وہ تحریک اسلامی کا ایک بہت ہی قیمتی اثاثہ تھے۔

خصوصی گوشہ

بیاد

مولانا طارق فارقلیط فلاحی رحمہ اللہ

۱۹۵۳ء تا ۲۰۱۴ء

سابق مدیر حیات نو

--- مجلس شوری انجمن طلبہ قدیم

--- مدیر ماہنامہ رفیق منزل

--- صدر حلقہ ایس آئی او یوپی مشرق

--- ناظم علاقہ جماعت اسلامی ہند (جھانسی و بنارس)

--- سکریٹری حلقہ جماعت اسلامی ہند یوپی مشرق

--- رکن مجلس نمائندگان جماعت اسلامی ہند

--- رکن شوری حلقہ یوپی مشرق

کچھ خصوصی گوشے کے بارے میں

سابق مدیر حیات نو مولانا طارق فارقلیط فلاحی رحمہ اللہ پر حیات نو کا خصوصی گوشہ پیش خدمت ہے۔

مرحوم کا شمار جامعۃ الفلاح کے اُن عزیز فرزندوں میں ہوتا ہے، جن پر جامعہ کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ آپ نے جامعہ سے تحریک اسلامی کی خدمت اوراس کے نصب العین کے لیے جدو جہد اور سخت جدو جہد کا جو درس حاصل کیا تھا، تادم زیست اُس کی عملی تصویر پیش کرتے رہے۔

مرحوم کا اصل میدانِ کار علمی وفکری تھا، یقیناً آپ کے اندر شروع سے قائدانہ صلاحیت اور قائدانہ کردار بھی پایا جاتا تھا، تاہم حیات نو اور رفیق منزل میں آپ کے اداریے اور دوسری تحریروں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا اصل میدان علمی وفکری ہی تھا، لیکن اتفاق کہئے کہ آپ کو اس میدان میں کام کرنے کا موقع کم ہی مل سکا، اور تحریک اسلامی کی دوسری تنظیمی ذمہ داریوں میں اس قدر مصروف ہوتے چلے گئے کہ پھر صحیح معنوں میں اِدھر پلٹ کر دیکھ بھی نہ سکے۔

آپ کا مطالعہ انتہائی وسیع اور گہرا تھا، اس سے بھی زیادہ مضبوط آپ کا مشاہدہ تھا۔ حالات پر گہری نظر رکھتے تھے، جب بھی ملاقات ہوتی، ملکی و عالمی حالات پر بھرپور تجزیہ سننے کا موقع ملتا۔

آپ کی تحریر بہت ہی پختہ اور ٹھوس ہوا کرتی تھی۔ سیاسی موضوعات پر بھی لکھتے تھے اور دیگر موضوعات پر بھی، البتہ جس موضوع پر بھی لکھتے عموماً تحریروں میں دعوتی رنگ نمایاں رہتا۔

مولانا حامد حسین مرحوم سابق امیر حلقہ اتر پردیش کی وفات پر انھوں نے حیات نو میں اداریہ لکھا، جس کا عنوان ہے ''ایک اور چراغ بجھ گیا''۔ تعزیتی تأثرات پر مبنی ہونے کے باوجود بھی اس اداریے میں دعوتی رنگ نمایاں ہے۔ آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ ''شمع کا کام روشنی پھیلانا ہے۔ وہ جلتی رہتی ہے، پگھلتی رہتی ہے اور ماحول کی تاریکیوں کو دور کرتی رہتی ہے۔ معمولی تاریکی ہو یا گھٹا ٹوپ اندھیرا، بادلوں کی گرج ہو یا چمک، بادنسیم کی خوشگوار ہوا ہو یا بادصرصر کے تیز وتند جھونکے، وہ جلتی رہتی ہے، کبھی اس کی لو تیز ہوتی ہے، کبھی مدھم، کبھی ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور کبھی کپکپاہٹ، مگر وہ سوز و درد سے پگھلتی رہتی ہے، اندھیرے سے کبھی مصالحت نہیں کرتی۔''

اسی طرح ایک دفعہ ملت اسلامیہ ہند کی موجودہ صورتحال اور مختلف ملی اشوز کے سلسلے میں ان کے احتجاجی رویے پر ایک بہت ہی شاندار اداریہ لکھا، اِس اداریے کے آخر میں ملت اسلامیہ کے مطلوبہ دعوتی کردار پر گفتگو

کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''طائف تو ایک واقعہ ہے، اور جب تک اسلام رہے گا، اور اسلام کے ماننے والے رہیں گے، اس کے مخالفین رہیں گے، اور شیطان صفت لوگ رہیں گے۔ یہ ہوتا رہے گا۔ اس کے ازالے کی یہ صورت نہیں ہے کہ ہم بھی گالیاں دیں، ایسا کرنے والوں کو برا بھلا کہیں، احتجاج اور مظاہرے کریں، توڑ پھوڑ پر اتر آئیں، بلاشبہہ کبھی یہ چیزیں بھی ضرورت بن جاتی ہیں، لیکن اس کے ازالے کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہم سیرت وکردار کے پیکر بن جائیں، نبوت کے اصولوں کو اپنائیں اور اخلاق وکردار کا اعلی نمونہ بن جائیں، وحی کے الفاظ میں 'ادفع بالتی ھی احسن ' کا ثبوت دیں، اور صاحب نبوت کی زبان میں اپنی زبان حال سے کہیں، 'وہ مجھے نہیں جانتے، وہ مجھے نہیں جانتے'۔''

مرحوم کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی اصول پسندی تھی، اصولوں سے کسی بھی صورت سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ اسی اصول پسندی کا نتیجہ تھا کہ کبھی کبھی آپ کو سخت رویہ بھی اختیار کرنا پڑتا تھا، البتہ بحیثیت مجموعی آپ کے اندر خوش مزاجی بھی تھی، اور دل نوازی بھی۔

تحریک اسلامی کے سلسلے میں بہت ہی فکرمند رہا کرتے تھے، تحریک کے پھیلتے ہوئے اسٹرکچر پر جب بھی گفتگو ہوتی، تشویش کا اظہار کرتے۔ ان کا ماننا تھا کہ تحریک کو اسٹرکچر کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اپنی بنیادوں اور اصولوں پر بھی سخت نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

نوجوانوں کے سلسلے میں بھی کافی فکرمند رہا کرتے تھے، جب بھی ملاقات ہوتی ایس آئی او آف انڈیا کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتے، نوجوانوں کے ذہن ودماغ میں کیا سوالات اٹھ رہے ہیں، وہ کیا سوچ رہے ہیں، اور کیا کچھ کرنا چاہتے ہیں، اس طرح کے نہ جانے کتنے سوالات تھے، جو وہ بار بار کیا کرتے تھے۔

جامعہ سے بہت ہی گہرا لگاؤ تھا، آخر تک جامعہ سے والہانہ تعلق رکھتے تھے، جب بھی ملاقات ہوتی، اندازہ ہوتا کہ آپ جامعہ کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں، وہاں کی موجودہ صورتحال سے باخبر، اور اس کے مستقبل کے سلسلے میں فکرمند رہتے ہیں۔ کہتے تھے کہ جامعہ مدارس اسلامیہ کی مجموعی صورتحال کے مقابلے میں آج بھی اپنے اندر ایک امتیازی شان رکھتا ہے، لیکن بہرحال اسے ابھی ترقی کی بہت سی منازل طے کرنا ہیں۔ تحریک اسلامی کے بزرگوں نے جن امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ جامعہ کا آغاز کیا تھا، ان تک پہنچنے کے لیے ابھی بہت کچھ درکار ہے۔

انجمن طلبہ قدیم سے شروع سے وابستہ رہے۔ کئی سال تک حیات نو کی ادارت فرمائی۔ انجمن کی مجلس شوری کے رکن بھی رہے۔ آپ جامعہ اور انجمن دونوں سے یک گونہ دلچسپی اور قلبی وابستگی رکھتے تھے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمت کے سایے میں جگہ دے، ان کی مغفرت فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

ابوالاعلی سید سبحانی

صدر انجمن کے تعزیتی تأثرات

جامعۃ الفلاح کے اغراض ومقاصد میں ایسے افراد کی تیاری کا ذکر ہے جو قرآن وسنت کی دعوت کے ساتھ غلبہ اسلام کے لیے جدوجہد کرسکیں۔ الحمدللہ جامعۃ الفلاح نے ایسے سپوت تیار کیے ہیں جو ان مقاصد کی عملی تعبیر ہیں اور انہیں مقاصد کو روبہ عمل لانے کے لیے اپنا خون جگر نچوڑ رہے ہیں۔

مولانا طارق فارقلیطؒ نے روز اول سے اپنی عملی جدوجہد کا محور ومرکز اسی میدان کو بنایا اور تادم آخر اسی سے شعوری طور پر وابستہ رہے۔ جستہ جستہ اور قسطوں میں تو تحریک کی ان گنت لوگوں نے خدمت کی ہے مگر محترم طارق فارقلیطؒ صاحب مکمل یکسوئی کے ساتھ مشنری انداز میں اس سے وابستہ رہے اور اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

دورِ طالب علمی ہی سے تحریک سے آپ کی علمی وعملی وابستگی رہی۔ ہندوستان کی معروف طلبہ تنظیم ایس آئی او کے تاسیسی ممبر رہے اور مختلف مراحل میں اس کی بعض کلیدی ذمہ داریاں بھی انہیں دی گئیں۔

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح سے بھی آپ کی وابستگی اول روز سے رہی اور اس کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر رہے۔ نیز ایک مدت تک انجمن کے ترجمان 'حیاتِ نو' کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ جامعۃ الفلاح اور انجمن طلبۂ قدیم سے متعلق آپ کی فکرمندی آپ کے بے لاگ تجزیوں اور تبصروں میں مضمر ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ محترم طارق صاحب جس چیز کو اجتماعیت کے لیے مفید تصور کرتے تھے اس کا اظہار برملا کردیا کرتے تھے۔

انجمن طلبۂ قدیم نے جب جامعۃ الفلاح کی تعمیر وترقی کے سلسلے میں چند اہم فیصلے لیے، اور ان کی اطلاع مرحوم طارق فارقلیط صاحب کو پہنچی تو انہوں نے بلاتردد اس کے ممکنہ اثرات سے ذمہ دارانِ انجمن کو آگاہ کیا، اور اپنے تجربات کی روشنی میں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

میرا تعلق محترم طارق صاحب سے دو حیثیتوں سے رہا ہے۔ ایک تحریکی نوعیت کا، اور دوسرا انجمن طلبۂ قدیم کے ذمہ دار کی حیثیت سے۔ دونوں حیثیتوں سے میں نے طارق فارقلیطؒ کو اجتماعیت کے لیے خیرخواہ پایا۔ ان کی یہ خیرخواہی ان کی تڑپ اور اجتماعیت کے لیے ان کی فدائیت میں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔

وہ میرے عزیز شاگرد تھے

(انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح اور ادارہ حیات نو کے اشتراک سے مرکز جماعت اسلامی ہند نئی دہلی میں منعقد تعزیتی نشست میں پیش کئے گئے تاثرات۔ادارہ)

ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

طارق فارقلیط صاحب سے میرا شروع سے ہی تعلق رہا ہے، جب وہ جامعہ آئے تھے۔اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یہ بچہ بہت ہی ہونہار ہے اور آگے چل کر یہ بہت ہی کام کا نکلے گا۔ میں نے اُس پر خصوصی توجہ دی، اور وہ بھی مجھ سے بہت زیادہ مانوس تھے۔

جب وہ جامعۃ الفلاح آئے تھے تو ان کا نام 'روزن' تھا۔مولانا شہباز صاحب مرحوم نے ان کا نام بدل کر طارق کر دیا تھا۔ بعد میں یہ طارق فارقلیط ہوگئے۔اُن کے نام میں فارقلیط کا اضافہ میری طرف سے تھا۔ میں نے ایک دفعہ اُن سے کہا کہ آج سے تم طارق فارقلیط ہو، اور پھر اس کے بعد سے انہوں نے اس کو اپنے نام کا حصہ بنالیا، اور ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ فارقلیط لکھتے رہے، اور یہی ان کی شناخت بن گئی۔

طارق فارقلیط شروع ہی سے بہت ہی سنجیدہ تھے۔طبیعت میں ظرافت تھی، لیکن ظرافت کے ساتھ ساتھ سنجیدگی تھی۔فضولیات سے انہیں بالکل بھی دلچسپی نہیں تھی۔ بچے عام طور سے کھیل کود میں لگے رہتے ہیں، اور فضولیات سے انہیں خاصی دلچسپی ہوتی ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ انہیں اس طرح کی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لائبریری میں خاصا وقت گزارتے تھے۔ اور کلاس میں ان کی بہت ہی نمایاں پوزیشن رہتی تھی۔ ہمیشہ مطالعہ کر کے آنا۔ جو کام دیا جائے اس کو اچھے ڈھنگ سے کر کے لانا۔قرآن کے پیپر میں بھی ان کے نمبرات بہت اچھے ہوتے تھے۔

ان کے اندر بہت سادگی پائی جاتی تھی۔ جو سادگی اس وقت تھی، وہ سادگی آخر تک برقرار رہی۔کسی طرح کا تکلف نہیں۔کسی طرح کا دکھاوا نہیں۔ بہت ہی سادہ زندگی۔اسی طرح ان کے مزاج میں صفائی ستھرائی بھی خوب تھی۔

حق گوئی ان کے اندر شروع سے موجود تھی۔ جامعۃ الفلاح میں مختلف مواقع پر اندازہ ہوا کہ بچہ جری ہے۔ بہت سے مواقع ہوتے ہیں، جبکہ طلبہ کو اساتذہ سے شکایت ہوتی ہے، اُس وقت وہ نمائندہ بن کر اساتذہ اور ذمہ داران سے ملتے تھے، اور جو شکایات ہوتی تھیں، ان کو بیان کرتے تھے، اور ان کے سلسلے میں گفتگو کرتے تھے۔

آخر تک ہمارا تعلق اور محبت برقرار رہی۔ بعد میں وہ مختلف عہدوں پر فائز ہوئے، اور میں اسی لحاظ سے ان کو عزت بھی دیتا تھا کہ وہ صدر حلقہ ہیں، یا سکریٹری حلقہ ہیں۔لیکن وہ ہمیشہ اس حیثیت سے ملے کہ ہمارے شاگرد ہیں۔ استاذ اور شاگرد کا یہ تعلق ہر تعلق پر بھاری تھا۔ اور انہوں نے ہمیشہ بہت ہی سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ اسی محبت اور تعلق کا نتیجہ تھا کہ ادھر چند سالوں سے میں الجامعہ الاسلامیہ شانتا پرم کیرلا تھا، ان کو جب معلوم ہوا کہ میں وہاں پر ہوں، تو انہوں نے اپنے بچے کو، جیسے ہی اس کی فلاح سے فراغت ہوئی، مجھ سے رابطہ قائم کیا، اور کہا کہ جس طرح آپ نے ہماری تربیت کی ہے، میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے کی بھی آپ تربیت کیجئے۔ 'مبشر' نام ہے ان کے بچے کا۔ مبشر کو انہوں نے ہمارے پاس شانتا پرم بھیجا۔ اس کا کلیۃ القرآن میں داخلہ ہوا۔ وہاں وہ دو سال زیر تعلیم رہا۔ اس دوران اس کو موقع ملا کہ وہ ہم کو سمجھے اور ہم اسے سمجھیں۔ مبشر کے اندر بھی اچھی صلاحیتیں ہیں۔ ادبی ذوق ہے، اور شعر وشاعری سے دلچسپی ہے اور بہت اچھے اشعار کہتے تھے۔ وہاں ادارہ ادب اسلامی کے پروگراموں میں اچھا کلام پیش کرتے تھے۔

طارق فارقلیط صاحب کے اندر بہت سی خوبیاں تھیں۔ ان کی سوجھ بوجھ، ان کی حق گوئی، جس بات کو غلط سمجھنا اس کو غلط کہنا، اس کا اظہار کرنا۔ جب برملا کہنے کا موقع ہوتا تو برملا کہتے تھے، اور جب کسی خاص فورم سے متعلق بات ہوتی تو وہاں رکھتے تھے۔ ان کی اسی حق گوئی کے نتیجے میں کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ بہت ہی روکھے آدمی ہیں۔لیکن میں ان کو بہت اچھا آدمی مانتا تھا۔ ایک ذمہ دار آدمی ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ جب کوئی غلط بات، خلاف حق بات یا منکر دیکھتا ہے تو اس پر اپنا احتجاج درج کراتا ہے۔

ذمہ داری کا احساس، ذمہ داری سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونا، ذمہ داری کو اچھی طرح سے ادا کرنا، یہ ساری چیزیں ان کے اندر موجود تھیں۔

آخر میں میں ایک احساس کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، جماعت نے اپنے اس طرح کے بہت سے قیمتی افراد کے ساتھ ہمیشہ ظلم کیا ہے، ایک انسان کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ قیمتی آدمی ہے اور بہت کام کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی صحت کی خود فکر کرے۔ دوسرے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ یہ شخص مریض ہے، ہارٹ کا مریض ہے، تو ان کی ذمہ داری ہے کہ اس کو ڈاکٹر کو دکھایا جائے، اس کا علاج کرایا جائے۔ جو لوگ ان کے آس پاس رہتے ہیں، ان کو اس کی فکر کرنی چاہئے، یہ ان کی ذمہ داری ہے۔لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو کام کرنے والے ہوتے ہیں، وہ رات دن ایک کر کے کام میں لگے رہتے ہیں۔ اپنی ہڈیاں گلا دیتے ہیں۔ اپنا خون جلا دیتے ہیں۔ جبکہ وہیں کچھ دوسرے لوگ خالی بیٹھے رہتے ہیں، اور عیش کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی کمی ہے اور بہت بڑا خسارہ ہے۔

بہرحال طارق فارقلیط صاحب بہت ہی اچھے لوگوں میں سے تھے۔ جماعت کے قیمتی لوگوں میں سے تھے۔ جامعۃ الفلاح کے مایہ ناز فرزندوں میں سے تھے۔ طارق فارقلیط ان لوگوں میں سے تھے، جن کے بارے میں میں فخر کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے عزیز شاگرد تھے۔

یہ چند باتیں ہیں، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ جو چیزیں انہیں یہاں نہیں حاصل ہوسکی ہیں، ان کی تلافی جنت میں ہو۔ اللہ تعالی انہیں جنت میں اعلی سے اعلی مقام عطا کرے۔ ان کو زیادہ سے زیادہ راحت پہنچے، اور اللہ تعالی ان سے جو کچھ بھول چوک ہوئی ہو، جو کچھ کوتاہی ہوئی ہو، اللہ تعالی غفور ورحیم ہے، وہ اپنے نیک بندوں کو اپنی رحمت کی چادر اڑھاتا ہے، ان سے درگزر فرماتا ہے، مجھے امید ہے کہ طارق فارقلیط اس دنیا سے جانے کے بعد اللہ تعالی کی رحمتوں کے سائے میں ہوں گے۔ اللہ تعالی ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے، اللہ تعالی ان کی قبر کو نور سے بھردے، ان کو کروٹ کروٹ جنت دے، ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔

سوچنے کا مقام

”تاریخ کے مختلف ادوار میں ایسے بہت سے مراحل آئے جب دشمنان اسلام کے حملوں سے ایسا محسوس ہوا کہ ہمارا وجود ختم ہوجائے گا، اور ہم مٹ جائیں گے اور باطل نے بھی ہمارے وجود کو ختم کرنے کے لیے مختلف پہلو بدلے، طرح طرح کی چالیں چلیں، اور نئے نئے طریقے ایجاد کئے۔ مگر ہم قائم رہے، ہمارا وجود باقی رہا، اور ان شاء اللہ باقی رہے گا۔ یہ شمع جو امت مسلمہ کی شکل میں جلائی گئی ہے، آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جل رہی ہے اور قیامت تک جلتی رہے گی اور روشنی بکھیرتی رہے گی، بھارت میں بھی یہ جلے گی اور روشنی بکھیرے گی، بلکہ اس کی لو اور تیز ہوگی اور تاریکیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گی، اے کاش باطل کو یہ حقیقت معلوم ہوتی!

تاہم ہمیں تھوڑی دیر ٹھہر کر سوچنا چاہئے کہ کیا یہ ابتلاء وآزمائش ہمارے ایمان اور اسلام کے نتیجے میں آرہی ہیں اور ہم کو کندن بنا کر آئندہ کے مراحل کے لیے تیار کرنے والی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں صبر اور ثبات کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور اللہ سے دعا کرنا چاہئے کہ اے اللہ ہم کو اتنا نہ آزما کہ ہم برداشت نہ کرسکیں اور اگر خدانخواستہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ تمام مصائب وآلام ہمارے اپنے اعمال اور کرتوتوں کے نتائج ہیں تو ہم کو جزع فزع کے بجائے توبہ واستغفار کرنا چاہئے اور اللہ سے قریب ہونے کی کوشش کرنی چاہئے، اس کے بغیر ہمارے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہوجائے گا۔“

از: **مولانا طارق فارقلیط فلاحی مرحوم،**
اداریہ رفیق منزل فروری ۱۹۹۱ء سے ماخوذ

آہ! اے ہمدم دیرینہ

مولانا محمد اسماعیل فلاحی، شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح۔ بلریا گنج

اے۱۹ء کی بات ہے جمعیۃ الطلبہ کا سالانہ مظاہرہ ہونے والا تھا۔ ساری تیاریاں مکمل تھیں۔ نہیں معلوم کیا وجہ تھی کہ ہندی کی تقریر نہ کسی طالب علم کو دی گئی تھی اور نہ کوئی اس کے لیے تیار ہوا تھا۔ وقت بہت کم تھا ایک یا دو دن پروگرام میں رہ گئے تھے۔ جمعیت کے ذمہ دار طلبہ پریشان تھے کہ اتنے کم وقت میں کون ساتھی تیاری کے ساتھ ہندی میں جمعیت کی نمائندگی کرسکتا ہے۔ ذمہ دار طلبہ میں یہ بات چل رہی تھی کہ کسی طرف سے آواز آئی کہ ثانوی کا طالب علم 'روزن' اسے بحسن وخوبی تیار کرلے گا۔ یہ 'روزن' کون تھا؟ معلوم ہوا کہ جیراج پور سے روزانہ جامعہ آنے والا درجہ آٹھ کا یہ طالب علم ہے، غیر معمولی ذہین اور خداداد صلاحیت کا مالک ہے، مکتب کے اساتذہ اس کی صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ اس کو یہ ذمہ داری دے دی گئی اور اس نے حیرتناک طریقہ سے بڑے کم وقت میں تقریر تیار کی اور جامعہ کی بہترین نمائندگی کی۔ (یہ گورکھپور ضلع میں اعظم گڑھ کی سرحد پر 'اُروا بازار' سے ۸ رکلومیٹر اور ''جتوار پور'' گاؤں کے رہنے والے تھے۔ جیراج پور میں اپنے کسی عزیز کے یہاں رہتے تھے۔)

اس سے پہلے میں بھی 'روزن' سے ناواقف تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس کا نام سنا۔ پھر ملاقات ہوئی، دیکھا معمولی کپڑے میں ملبوس، سیدھا سادا، بھولا بھالا، کسی غریب خاندان کا چشم و چراغ معلوم ہورہا تھا، اس وقت کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ سانولی رنگت کا یہ لڑکا آگے چل کر اپنی شان آپ پیدا کرے گا، اور اللہ تعالیٰ اس سے اپنے دین کی بڑی خدمت لے گا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اس طالب علم نے دومرتبہ اپنے حالات کی ناسازگاری کے سبب پڑھائی ترک کردینا چاہی۔ خوش قسمتی سے ان دنوں مولانا شہباز اصلاحی نور اللہ مرقدہٗ جیسی مردم شناس شخصیت جامعہ میں موجود تھی، جس کی نگاہ میں بہ یک وقت ابتدائی سے لے کر دینیات تک کے طلبہ رہتے تھے، اور جنھیں عام طور سے سب کے ذاتی احوال وکوائف سے واقفیت رہا کرتی تھی، انھوں نے سمجھا بجھا کر، ہمت دلا کر، اور کٹھن حالات سے نمٹنے کا گُر سکھا کر 'روزن' کو اس ارادے سے باز رکھا۔

طارق صاحب عربی شعبے میں آ گئے تو بورڈنگ میں منتقل ہو گئے، عربی دوم سوم تک ان کا جیراج پور آنا جانا رہا، پھر آہستہ آہستہ بند ہو گیا۔

مولانا نور محمد فلاحی مرحوم سابق سکریٹری انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح نے مجھ سے خود اپنی روداد سنائی تھی کہ میں اپنے گھریلو حالات سے مجبور تھا، میری پڑھائی چھوٹ رہی تھی آگے تعلیم جاری رکھنے کی کوئی سبیل نہ تھی، مجھے بڑا دکھ تھا، آنکھوں میں آنسو تھے، ان حالات میں مولانا شہباز اصلاحی میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے، انھوں نے مجھے تسلّی دی، آنسو پونچھے، گھر والوں سے بھی ملے اور میرے راستے سے رکاوٹیں دور ہو گئیں۔

بہر کیف ذکر چل رہا تھا 'روزن' کا، روزن ثانوی مکمل کرنے کے بعد عربی اول میں آ گئے۔ مولانا شہباز اصلاحیؒ نے کہا یہ 'روزن' کیا ہے، تمہارا نام طارق رہے گا، اب وہ 'روزن' سے طارق ہو گئے۔ اسی طرح ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی صاحب جامعہ میں داخلہ کے لیے آئے تو اس وقت ان کا نام تھا ''تبارک اللہ''، انھیں لے کر بھائی عبد اللہ نیپالی جو آخری درجات کے طالب علم تھے، آئے تھے۔ مولانا شہباز صاحب نے ان سے کہا یہ کیا نام ہوا؟ پھر نام بدل کر عبید اللہ رکھ دیا۔ کیسے اچھے دن تھے وہ، اور کتنی سہولت کا تھا وہ زمانہ! آج اگر کوئی اپنا الٹا سیدھا نام بدل کر مناسب نام رکھنا چاہے تو اسے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں وہی جانتا ہے۔ ابتدا میں چند سالوں تک طارق نے اپنے نام کے آگے ندیم لگایا۔

طارق کا کلاس اس اعتبار سے ممتاز تھا کہ اس میں متعدد ذہین اور محنتی طلبہ تھے جن میں باہم مسابقت اور کمپٹیشن کا ماحول رہتا تھا، اسی درجہ میں عبید اللہ تھے، مزمل تھے، افکار تھے، عبد الباری تھے، حافظ احسان الحق تھے، کس کس کا نام لیا جائے، یہ درجہ درسی اور غیر درسی مطالعہ اور تحریر و تقریر میں نمایاں مقام رکھتا تھا، یہ سب بڑے خوش اطوار اور خوش اخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے جری اور بے باک قسم کے طلبہ تھے۔ ممتاز عالم دین اور اسلامی مفکر، مربی اور مشفق استاذ مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی حفظہ اللہ کی خدمات ان دنوں جامعہ کو حاصل تھیں۔ وہ طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے مختلف قسم کے القاب دیا کرتے تھے، مزمل کو 'صقر' کا خطاب دیا تو عبید اللہ کو 'فہد' سے پکارا، اور طارق کو 'فارقلیط' کے لقب سے ملقب کیا۔ اب یہ ''روزن'' سے طارق فارقلیط ہو گئے اور ندیم کا لفظ ہمیشہ کے لیے متروک ہو گیا۔

طارق فارقلیط نے بڑی محنت اور لگن سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ذہین تو تھے ہی، انھوں نے اور ان کے ان ساتھیوں نے جن کے اوپر نام آئے ہیں اس وقت کی لائبریری کی تمام اہم کتابیں چاٹ ڈالیں اور باقاعدہ ان کے نوٹ تیار کیے۔ درسی کتابوں کا نوٹ تو یہ سبھی بڑے اہتمام سے تیار کیا کرتے تھے جس سے استفادہ بعد کے بعض سینئر اساتذہ نے بھی کیا۔

اس زمانہ سے ان سبھی سے میرے گہرے مراسم رہے ہیں۔ طارق فارقلیط کا مطالعہ بھی گہرا تھا اور اردو

ادب میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ طالبعلمی کے زمانے میں ان کے مضامین ادب کا شاہکار ہوا کرتے تھے، افسانے ان کے بڑے مؤثر اور سماجی حالات کے عکاس ہوتے تھے۔ ان میں سے بہت سے مقالے جمعیت کے قلمی رسالوں کی زینت بنتے تھے۔ افسوس ہے کہ بعد کے ذمہ داران جمعیت ان رسالوں کی حفاظت نہیں کر سکے۔ میری معلومات کے مطابق فلاحی برادری میں سب سے زیادہ مقالے، ترجمے اور تصانیف برادرم عبیداللہ فہد کی ہیں۔ برادرم طارق فارقلیط کے زمانہ طالبعلمی کا مطالعہ، ان کی دینی وعصری معلومات، حالات حاضرہ اور معاصر تحریکات پر نگاہ اور ان کی ادبی صلاحیت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر تنظیمی مصروفیات نے ان کے اوقات کو نچوڑ نہ لیا ہوتا اور یہ فنافی التحریک نہ ہوئے ہوتے تو ان کی بھی تصانیف، ترجمے اور مقالے فلاحی برادری میں نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے۔

جامعہ سے فراغت کے بعد کچھ دنوں یہ صوبہ کرناٹک میں شیموگھا کے کسی مقام پر رہے۔ تادم تحریر مقام کا نام یاد نہیں۔ شیموگھا سے ہاسن میں ''ارے ہلی'' کے رفقاء نے انھیں بلالیا۔ انھوں نے یہاں جوانوں اور بچوں دونوں کو پڑھایا، اور تحریکی کاموں میں بھرپور حصہ لیا۔ وہاں وہ اپنی محنت، لگن اور اخلاق کی وجہ سے ہر دلعزیز رہے۔

پھر انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی شوریٰ کی نگاہ اپنے مجلّہ حیات نو کی ادارت کے لیے ان پر پڑی، اور وہ وہاں سے دوبارہ جامعۃ الفلاح آ گئے، میں بھی دکن ہی میں تھا، کچھ دنوں بعد میں بھی جامعہ آ گیا۔ یہاں ہم لوگوں کا بڑا اچھا ساتھ رہا۔ بالعموم ایک ساتھ کھانا کھاتے، علمی وتفریحی مجلسیں ہوئیں، حالات حاضرہ پر تبصرے ہوتے، کبھی کبھی افراد بھی زیر بحث آتے، طارق فارقلیط پورے طور سے ان میں حصہ لیتے۔ کھانے میں بالعموم جناب فاروق ندوی، حامد علی ساغر، اور عبدالرحمٰن خالد شریک رہتے۔ انھوں نے اس دوران حیات نو پر خصوصی توجہ دی۔ کوئی دوسرا معاون نہیں تھا۔ اکیلے سارے کام کرتے۔ پھر اس کے بعد ایس آئی او یوپی کے صدر کے حیثیت سے لکھنؤ منتقل ہونا پڑا۔ چلتے وقت الوداعی نشست میں انھوں نے انجمن کے افراد کو جو مجلس میں اساتذہ کی حیثیت سے موجود تھے۔ اپنی تقریر میں جماعت میں باقاعدہ شمولیت کی دعوت دی، جو بعض لوگوں کو اچھی لگی اور بعض کو خراب۔ ان کے جانے کے بعد ہماری وہ مستقل مجلسیں باقی نہ رہ سکیں۔

طارق فارقلیط صاحب نے اپنے دورِ صدارت میں جناب نصرت علی صاحب کو اپنا سکریٹری مقرر کیا، جس کے نتیجہ میں ان کی تنظیمی صلاحیتیں نکھریں، اس میں طارق فارقلیط کا خاصا حصہ ہے۔ انھوں نے اپنے دور میں یوپی میں مشرق اور مغرب سب میں ایس آئی او کے کام کو بہت آگے بڑھایا، شہر شہر اور گاؤں گاؤں پہنچے، ہر جگہ سے سعید روحوں کو کھینچا، اللہ تعالیٰ نے لکھنے کے ساتھ ساتھ خطابت کی صلاحیت بھی بخشی، برمحل برجستہ اشعار ان کی تقریر کے اثر کو دوبالا کر دیتے تھے۔ پھر انہیں ایس آئی او کے ترجمان رفیق منزل کی ادارت سنبھالنے کے لیے دہلی منتقل ہونا پڑا، اور اس بہانے ان کا تعلق ملک کے ہر حصے سے قائم ہو گیا۔ انھوں نے رفیق منزل کے لیے

بڑی محنت کی۔ ان کے اداریے بڑے شوق سے پڑھے جاتے۔ ان کی ادبی وصحافتی صلاحیت اور ذوق کا اندازہ حیات نو اور رفیق منزل کے اداریوں سے لگایا جاسکتا ہے اور یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حد سے بڑھی جماعتی مصروفیات نہ ہوتیں تو وہ تصنیف وتالیف کے میدان میں بہت آگے جاتے۔

دہلی قیام کے دوران ایک بار ایسا ہوا کہ جماعت کے تمام ذمہ دار کسی دوسری جگہ گئے ہوئے تھے، مرکز بالکل خالی تھا۔ مرکز اور اس کے آس پاس کا علاقہ حکومت کی طرف سے اجازت کے بغیر آباد ہو رہا تھا۔ ایک دن صبح سویرے حکومت کا عملہ فورس کے ساتھ پہنچ گیا، اس کی کوشش تھی کہ پورا علاقہ خالی کرادیا جائے اور حکومت پورے علاقہ کو اپنی تحویل میں لے لے۔ پورے علاقے کو گھیرنے کے لیے جگہ جگہ گڈھوں کی کھدائی شروع ہوگئی، سریوں اور گٹیوں سے سمنٹیڈ ستون اٹھائے جانے لگے۔ اس موقع پر طارق صاحب نے بڑی حوصلہ مندی سے کام لیا، مرکز میں وہی تنہا تھے، ایک طرف تو نوجوانوں کو بڑی تعداد میں اکٹھا کرلیا، دوسری جانب دہلی کے مسلم اور غیر مسلم سرکاری وغیر سرکاری اہم شخصیتوں سے فون پر رابطہ بنائے رکھا، اور جو عملہ وہاں موجود تھا اسے مختلف باتوں میں الجھائے رکھا۔ اس دوران نوجوانوں نے تمام ستون اکھاڑ پھینکے، اور دہلی حکومت کی وہ مہم کامیاب نہ ہوسکی۔

طارق فارقلیط حق پسند، حق گو، نڈر، جری، بے باک، اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ جس بات کو وہ حق سمجھ لیتے اس کا بے باک اظہار کرتے۔ چاہے کوئی ناراض ہو یا خوش۔ سوچ سمجھ کر ایک رائے قائم کرتے، اور اس پر جم جاتے اور اس کے لیے ان کے پاس دلائل ہوتے۔ ان سطور کے لکھتے وقت میری نگاہ میں تین ایسے فلاحی برادران ہیں جن سے مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے ان کے سامنے چل نہیں پاتے، میں ایسی کئی مجلسوں میں شریک رہا ہوں۔ اگر کسی وجہ سے یہ لوگ مجلس میں نہ آسکیں تو بعض لوگوں کو خوشی ہوتی ہے کہ بڑی آسانی سے وہ اپنی بات منوالیں گے۔ ان تینوں کا دماغ قانونی تھا، قانون اور دستور کی زبان کا فہم ہر ایک کو یکساں حاصل نہیں ہوتا، قانون اور دستور کی نزاکتوں کے سمجھنے میں ان تینوں کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ ان تینوں میں سے ایک طارق فارقلیط تھے۔ دو زندہ ہیں۔ اللہ انھیں زندہ رکھے اور دین وملت کی زیادہ سے زیادہ خدمت لے۔

دراصل طارق غلط بات برداشت نہیں کرسکتے تھے، ان کے یہاں حق کے معاملہ میں مداہنت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ جماعت وتحریک کے لیے سراپا اخلاص تھے۔ کہیں اس پہلو سے کوتاہی یا دانستہ جماعتی پالیسی کی خلاف ورزی نظر آتی، تو وہ اسے نظر انداز نہیں کرسکتے تھے، اور اس معاملہ میں کبھی کبھی ان کا انداز سخت ہوجاتا تھا۔ اس طرح کے لوگ ان سے شاکی رہا کرتے تھے۔ وہ جماعت کے افراد کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ وہ دوست اور دوست نما دونوں کو خوب جانتے تھے۔

طارق فارقلیط لوگوں کے پیچھے بھاگنے والے نہیں تھے۔ ہر معاملے میں ان کی سوچی سمجھی ایک رائے

ہوتی تھی۔ ہمارے طالب علمی کے زمانہ میں ایک ایسی بات ہوگئی اور ہوتی رہی جس پر تمام اساتذہ اور طلبہ نالاں تھے۔اس پر زبردست ہنگامہ ہوا۔اسٹرائک کی کیفیت ہوگئی۔طلبہ نے بزوراس چیز کوروک دیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس پورے معاملہ میں اساتذہ کا احترام کہیں بھی مجروح نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ طارق فارقلیط کے کلاس میں ایک استاذ نے اس پرایسا تبصرہ کردیا کہ لڑکے مشتعل ہوگئے اورانہوں نے اس معاملہ کواپنے ہاتھ میں لے لیا۔لیکن طارق فارقلیط کی رائے یہ تھی کہ ایسا کرنا صحیح نہیں ہے۔اور وہ پورے طور سے اس سے الگ رہے اور استاذ کے تبصرے کو بھی انہوں نے پسند نہیں کیا۔جبکہ طارق فارقلیط کا لگ بھگ پورا کلاس اس میں پیش پیش تھا۔

ایس آئی او سے فراغت کے بعد وہ کاروبار کرنا چاہتے تھے۔اس کے لیے انھوں نے تیاری بھی کرلی تھی۔ لیکن جماعت نے انھیں آواز دی اور انھوں نے لبیک کہا۔ ناظم علاقہ بانسی اور ناظم علاقہ بنارس کی حیثیت سے بڑی محنت کی۔ایک ایک گاؤں گئے،ایک ایک فرد سے ملے،انفرادی ملاقات بھی کی،اجتماعی ملاقات بھی کی۔ سوتوں کو جگایا، جگنے جاگنے والوں کوجھنجوڑااورانھیں متحرک اور فعال بنادیا۔رکاوٹیں اور دشواریاں راہ میں حائل ہوئیں،لیکن وہ کہاں ان کوخاطر میں لانے والے تھے۔

تحریک کے لیےفدوئیت،قربانی اورایثاران کااس وقت کھل کرسامنے آیاجب ولی اللہ سعیدی امیر حلقہ کو حلقہ میں اپنے سکریٹری کے لیے سب سے موزوں شخصیت طارق فارقلیط کی نظر آئی۔جاننے والے جانتے ہیں کہ طارق فارقلیط علم،تجربہ،صلاحیت اور جماعت کے لیے ایثاروقربانی اورعمر میں بہت آگے تھے لیکن انھوں نے اس پیشکش کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرلیا۔ یہ ہوتا ہے اسلامی تحریکوں کا کمال،'انا' کے حصار میں قید شخص تحریکوں میں نہیں چل سکتا یہاں'انا' کوقربان کرنا پڑتا ہے۔ہمارے نزدیک طارق فارقلیط کی یہ بہت بڑی قربانی تھی اور جماعت کے لیے ان کے اخلاص کی بہت بڑی دلیل۔انھوں نے ولی اللہ سعیدی کی ماتحتی میں رہتے ہوئے پوری تندہی کے ساتھ جماعت کےنظم کومنظم کیااوراس کے لیے اپنی صحت کی پروانہیں کی۔شروع میں کھل کرانھوں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ ولی اللہ سعیدی کا تعارف کرایااورٹکراؤ کی پالیسی کے بجائے تعاون کی پالیسی اپنائے رکھی۔کم ازکم ایک معاملہ میرے علم میں ہےجس میں طارق فارقلیط کی رائے کچھ تھی اور ولی اللہ سعیدی کی کچھ اور۔لیکن طارق فارقلیط نے اسے وقار کا مسئلہ نہیں بنایا اور ولی اللہ سعیدی کے فیصلہ کا ساتھ دیا۔اس جذبےاورحوصلے کےبغیرتحریکیں نہیں چلاکرتیں۔

طارق فارقلیط حلقہ کے ہرطرح کے کاموں کے لیےمرجع تھے۔پورے حلقہ پرنگاہ تھی،کوئی بھی معاملہ ہو، کیسےحل کیاجائے ان کامشورہ بہت مناسب ہوتا حلقہ سے آگے بڑھ کر پورے ملک کی تحریک پران کی نظرتھی۔

طارق فارقلیط بڑےخوددارانسان تھے۔ وہ غریب گھرانے کے پروردہ تھے۔غریبوں کے دردکواچھی طرح سمجھتے تھے،انھوں نے اپنی پوری زندگی جماعت کے لیے وقف کردی۔ جماعت اوراس کے وسائل اور

اپنے اثر ورسوخ سے اپنا گھر نہیں بھرا۔ اپنے بچوں کی دینی نہج پر تربیت کی۔ ایک بیٹا تھا مبشر، اسے فلاحی بنایا، ماشاءاللہ وہ صالح نوجوان ہے۔ چار بیٹیاں ہیں، سب جامعۃ الصالحات بانسی میں زیر تعلیم ہیں۔ ایک بچی آخری درجہ میں ہے۔

جب ملتے مسکراتے چہرے سے ملتے۔ ہمیشہ حوصلہ دیتے۔ مجھے وہ بہت پسند تھے، طالب علمی کے زمانہ سے۔ اللہ کے لیے ان سے محبت تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی مجھ سے اللہ کے لیے محبت کرتے تھے۔

دل کے آپریشن کے بعد میری ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ مرکز میں ٹھہرے ہوئے تھے، گھبراہٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ''کیا حافظ جی! مرنے سے کیا ڈرنا، جب وقت آئے گا چل دیں گے (چل دیں گے کہتے ہوئے انھوں نے آنکھیں بند کرلیں) دعا کیجئے گا''، نہیں معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ثابت ہوگی۔ ڈاکٹروں کو دکھایا تو ڈاکٹروں نے فوراً آپریشن کا مشورہ دیا۔ دل کے چار وال بند تھے، لیکن وہ لکھنؤ آئے، تمام ضروری کام کیا، بعد میں پھر دہلی جاکر آپریشن کرایا۔

ڈاکٹروں نے لمبے عرصہ تک آرام کی ہدایت کی تھی لیکن کچھ عرصہ بعد جب ان کی طبیعت بحال ہوئی تو ان کے دل نے یہ گوارا نہیں کیا کہ گھر بیٹھے رہیں، وہ حلقہ میں آگئے، دوبارہ کام کاج سنبھال لیا۔ انھیں ابھی آرام کرنا چاہیے تھا لیکن جماعتی فکر نے انھیں گھر میں بیٹھنے نہیں دیا۔ ایسے ہی فنا فی اللہ لوگوں سے تحریکوں کو گرم گرم خون ملتا ہے اور تحریکیں تیزی سے آگے بڑھتی ہیں۔

رمضان کا آخری روزہ تھا۔ سحری کھائی تھی۔ ابھی فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی کہ موبائیل کی گھنٹی بجی، موبائیل اٹھایا تو دوسری جانب استاذ گرامی مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی سابق مہتمم جامعۃ الفلاح بول رہے تھے کہ طارق فارقلیط صاحب کا کچھ دیر پہلے انتقال ہوگیا، میں نے دوبارہ پوچھا طارق فارقلیط صاحب کا؟ انھوں نے کہا ''ہاں''۔ دل کی حرکت تیز ہوگئی، خبر پر یقین کرنا پڑا، آنکھوں میں آنسو آگئے، دیر تک توبہ واستغفار اور دعا کرتا رہا۔

حق مغفرت کرے بڑی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

فراست فلاحی کی حامل شخصیت

انتظار نعیم، اسسٹنٹ سکریٹری جماعت اسلامی ہند

جماعت اسلامی ہند حلقہ اتر پردیش مشرق کے آفس 'دارالاسلام' مولوی گنج لکھنؤ اکثر آنا جانا ہوتا ہے، لیکن اب جانا ہوگا تو نگاہیں طارق فارقلیط فلاحی صاحب کو نہ ڈھونڈ پائیں گی، نہ دیکھ پائیں گی، اور دل کے رنج واضطراب میں مزید اضافہ کریں گی۔ وہ جس سے ایک طویل مدت کی رفاقت ومحبت کا تعلق تھا، بیماریٔ دل کی تاب نہ لا کر چپکے سے دنیا سے رخصت ہوگیا، انا للہ و انا الیہ راجعون

طارق فارقلیط صاحب کی رحلت کی خبر دہلی آئی تو جامعۃ الفلاح میں ان کی طالب علمی، ایس آئی او، رفیق منزل اور جماعت اسلامی ہند سے ان کی ذمہ دارانہ وابستگی کے تمام ادوار نگاہوں میں گھوم گئے۔ میرا احساس ہے کہ عظیم درس گاہ جامعۃ الفلاح کے وہ ایسے باصلاحیت طالب علم رہے کہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان کے احباب واساتذہ اور خود جامعہ انہیں تادیر یاد رکھیں گے۔ ماہنامہ رفیق منزل کی ان کی ادارت کے دور کی فائلیں جب بھی کسی کی نگاہ سے گزریں گی، ان کی بصیرت اور دانشوری کی جھلک ان کی تحریروں کے صفحہ صفحہ پر بکھرتی نظر آئیں گی۔ ان سے میری شائد ہی کوئی ملاقات ایسی گزری ہو جب میں نے ان کو حلقہ اتر پردیش مشرق کی سکریٹری شپ کی اہم ذمہ داری نبھانے کے ساتھ ساتھ کچھ تصنیفی کاموں کی طرف متوجہ نہ کیا ہو۔ افسوس کہ وہ بھی اُس کمزوری کے شکار رہے جس میں تحریک کے بہت سے ذمہ داران اور احباب گرفتار ہیں اور بہترین تصنیفی صلاحیتوں کے باوجود اس کے استعمال سے گریزاں رہتے ہیں۔ طارق فارقلیط صاحب حلقہ یوپی مشرق کے سکریٹری کی حیثیت سے بہت ذمہ دارانہ انداز میں تحریکی فریضہ انجام دیتے رہے، اور دینی، ملی، ملکی، سیاسی وعالمی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے، اور حسب ضرورت ان پر بھرپور فراست کے ساتھ اظہار کرتے تھے۔ بظاہر خشک مزاج، لیکن شائد ہی کوئی تنظیمی یا ادبی محفل ایسی رہی ہو جس میں وہ موجود رہے ہوں اور اس کو موقع پا کر قہقہ زار نہ بنا دیا ہو۔ اپنی ان ہی ہمہ جہت صلاحیتوں اور طرز حیات کی بنا پر وہ بے شمار دوستوں میں محبوب تھے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنا سب کچھ اپنے رب کی رضا وخوشنودی کی راہ میں لگا دیں۔ اللہ تعالی ان کی خامیوں سے درگزر فرمائے، ان کے حسنات کی قدر افزائی فرمائے اور اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے، آمین

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی

مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی، رکن مرکزی مجلس شوریٰ، امیر حلقہ اتر پردیش مشرق

یوں تو مولانا طارق فارقلیط فلاحی صاحب مرحوم مجھ سے عمر میں تقریباً 17، 18/سال بڑے تھے۔ لیکن ہم دونوں آپس میں اتنے بے تکلف ہو گئے تھے کہ ایک دوست کی طرح رہتے تھے۔ مجھے کوئی بات کھٹکتی تو ان سے بے جھجک پوچھتا اور اگر انہیں کبھی کوئی چیز محسوس ہوتی تو بے دھڑک مجھ سے کہتے۔ مجھے جب امیر حلقہ مقرر کیا گیا تو وہ بنارس کے ناظم علاقہ تھے۔ میں نے ان کو بلا کر اپنے کمرے میں کہا کہ مولانا! مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ آپ لکھنؤ تشریف لائیے اور حلقہ کو سنبھالنے اور اسے منظّم کرنے میں میری مدد کیجئے۔ انھوں نے کہا ٹھیک ہے۔ بس وہ دن اور انتقال کا آخری دن، انھوں نے اپنے وعدے کو نبھانے میں اپنی آخری سانس تک لگا دی۔ افطار کٹ کی تقسیم اور غرباء و مساکین کی مدد میں وہ آخری دن بھی مصروف رہے۔

میری ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ مجلّہ حیات نو کے ایڈیٹر تھے۔ میں جامعۃ الفلاح میں زیر تعلیم تھا۔ نشست و برخواست اور کردار و گفتار میں نستعلیقی انداز۔ اپنے کام سے کام۔ وہ زیادہ کسی سے بولتے نہیں تھے۔ مجلّہ حیات نو کو منظّم کرنے اور اسے ایک معیار دینے میں ان کا خاص رول رہا۔ انھوں نے مجلّہ حیات نو کے خاص نمبر نکالے جس سے اس کی وقعت میں کافی اضافہ ہوا۔

مولانا طارق فارقلیط صاحب، بچپن سے ہی کافی ذہین تھے۔ ان کے اساتذہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ اچھے سوالات کرتے۔ مطالعہ کر کے کلاس میں آتے اور نوٹس کو سلیقہ سے تیار کرنے کا ان کا مخصوص ذوق تھا۔ ان کے انتقال کے بعد میرے پاس بے شمار تعزیتی فون آئے۔ بیرون ملک سے ایک صاحب نے تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ طارق صاحب پڑھنے میں بہت اچھے تھے انھوں نے بعض بزرگ اساتذہ کی تدریس کا نوٹ بڑے سلیقہ سے تیار کر رکھا تھا۔ ان کے ذخیرہ کتب میں موجود ہوگا۔ بچپن ہی میں ان کے رکھ رکھاؤ اور نستعلیقی انداز کی وجہ سے ان کے بعض سینئر ساتھی طالب علمی کے دور ہی میں ان کو ''مولانا'' کہہ کر پکارتے تھے۔

فراغت کے بعد چند سال انھوں نے کرناٹک، ہاسن کے علاقہ میں تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ جناب رفیق

احمد صاحب، مرکز نے بتایا کہ وہاں کثیر تعداد میں مرد و خواتین ان کے شاگرد موجود ہیں جنہوں نے مولانا سے استفادہ کیا ہے۔ اصلاحی اور تربیتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ جمعہ کا خطبہ بھی دیتے تھے جس سے کافی تعداد میں لوگ فائدہ اٹھاتے۔

مولانا طارق فارقلیط صاحب sio کے تاسیسی ممبر تھے۔ وہ sio اتر پردیش کے تیسرے صدر حلقہ منتخب کئے گئے۔ اس وقت پورا یوپی ایک تھا بلکہ یوپی کے ساتھ دہلی بھی ہوا کرتا تھا۔ مولانا نے کافی محنت کی۔ پوری یوپی کا منظّم اور تفصیلی دورہ کیا۔ تقریباً ہر اہم مقام پر تنظیم کی شاخ قائم کی۔ ان کے زمانے میں بڑے پیمانے پر یوپی میں توسیع کا کام ہوا۔ وہ ہر مقام پر تنظیم کو منظّم کرنے کیلئے کوشش کرتے، ذمہ داروں کو متعین کرتے، وہاں کی تفصیلی چیزیں اپنی ڈائری میں قلمبند کرتے اور بعد میں ذمہ داروں سے مستقل ربط رکھتے۔ ان کا دور sio یوپی کی تاریخ میں سنہرے دور سے یاد کیا جائے گا۔

رفیق منزل دہلی کی ادارت کی ذمہ داری بھی ان پر ڈالی گئی جسے انہوں نے بحسن وخوبی نبھایا۔ وہ دہلی منتقل ہو گئے اور یکسوئی کے ساتھ رفیق منزل کی خدمت کی۔ چونکہ ان کا مطالعہ اچھا تھا اور لکھنے پڑھنے کا ذوق پرانا تھا لہٰذا انھوں نے رفیق منزل کو بنانے اور سنوارنے میں بہترین رول ادا کیا۔ ان کی کوششوں اور محنتوں سے رفیق منزل کے وقار میں اضافہ ہوا۔

جناب مولانا محمد رفیق قاسمی صاحب (سکریٹری مرکز) اس وقت امیر حلقہ تھے۔ مولانا نے طارق فارقلیط صاحب کو لکھنؤ بلالیا۔ مولانا قاسمی صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ رہی کہ آپ نے اپنے دور امارت میں افراد کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ انھیں جماعت کیلئے فراہم کرنے کا گراں قدر کام انجام دیا۔ مولانا قاسمی صاحب نے طارق صاحب کو آگے بڑھایا۔ کچھ دنوں وہ قاسمی صاحب کی ہدایت پر حلقہ سے خبر نامہ نکالتے رہے اور اس کے بعد جھانسی علاقہ کے ناظم بنادیئے گئے۔

مولانا طارق صاحب نے جھانسی جیسے سخت علاقہ میں کام کیا۔ سخت آب وہوا کے لحاظ سے بھی کہ گرمی اور ٹھنڈک کے موسم اپنی انتہاء کو پہنچتے ہیں نیز اس علاقہ میں پانی کی بہت قلت ہے اور جماعتی پہلو سے بھی بہت سخت کہ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب اس علاقے میں بہت کم ہے اور ارکان اور جماعتوں کی تعداد بھی محدود ہے۔ مولانا طارق صاحب نے بڑی محنت سے اپنی ذمہ داریاں انجام دیں اور نئے نئے مقامات پر کام کا تعارف کروایا۔ اس علاقہ میں ریلیف ورک بھی کافی سلیقہ سے کیا۔ آج بھی اس علاقہ کے رفقاء واحباب مولانا کو یاد کرتے اور ان کا ذکر خیر کرتے رہتے ہیں۔

جناب نصرت علی صاحب (قیم جماعت) کی امارت حلقہ کے زمانے میں بنارس کو نیا علاقہ بنایا گیا۔ مولانا طارق صاحب کو اس نئے علاقہ کا ناظم مقرر کیا گیا۔ مولانا نے اس علاقہ میں بھی کافی محنت سے کام کیا اور اس علاقہ کی توسیع واستحکام میں اپنی توانائیاں لگائیں۔ اسی وجہ سے علاقہ بنارس میں بھی ہر مقام پر رفقاء واحباب ان

کو یاد کرتے ہیں۔اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا کا گاؤں بہت دیہات میں ہونے کے باوجود علاقہ بنارس کے دور دراز کئی مقامات سے رفقاء ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔

جب ان کو سکریٹری حلقہ مقرر کیا گیا تو بعض بزرگ احباب کو اندیشہ تھا کہ وہ اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے کیا یہ بڑی ذمہ داری نبھا پائیں گے؟ لیکن اپنی صلاحیت، سوجھ بوجھ اور جماعتی وفکری پختگی کی وجہ سے نہ صرف انہوں نے ذمہ داری سنبھالی بلکہ سکریٹری کے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ رپورٹ کی تیاری، نظماء علاقہ سے روابط، ان سے رپورٹ اور گوشوارہ کی وصولیابی، بیت المال کے حسابات کی نگرانی اور دفتر حلقہ کے انتظام وانصرام کو انہوں نے بڑے سلیقے سے انجام دیا۔ جب مجھے امیر حلقہ مقرر کیا گیا تو ذمہ داران حلقہ اور نظماء علاقہ کے درمیان میں سب سے کم عمر تھا، اس کے باوجود مولانا نے ہمیشہ منصب کا خیال رکھا اور نظم کے تقاضوں کو پورا کیا۔ یہ ان کا بڑکپن تھا۔ کبھی کبھی ان کے بے جا احترام پر مجھے شرمندگی ہوتی۔ نظماء علاقہ ان کی ان ساری صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اور آج جب مولانا ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ہم میں سے ہر شخص کو مولانا کی کمی کا احساس ستاتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کا اندازہ مزید بڑھ کر سامنے آتا ہے۔

مولانا طارق فارقلیط صاحب کی ایک بڑی خوبی ان کی مردم شناسی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کی ملاقات میں آدمی کو پہچان جاتے تھے۔ بعض لوگوں کے بارے میں صرف حلیہ اور قیافہ سے ہی اندازہ لگا لیتے تھے کہ یہ شخص کیسا ہے۔ مجھے متعدد بار بڑی حیرت ہوئی کہ مولانا بہت سارے لوگوں سے بے ربط رہنے کے باوجود ان کے بارے میں بھی اپنی رائے رکھتے ہیں۔ میری معلومات میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے کہ مولانا نے کسی شخص کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہو اور بعد کے ایام میں، تجربہ نے اسے ثابت نہ کر دیا ہو۔

مولانا طارق صاحب ہر مسئلہ میں اپنی ایک رائے رکھتے تھے۔ یہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے کہ ہاؤس کا رخ دیکھ کر اپنی رائے بنائیں یا لوگوں کا ڈسکشن سن کر اپنا موقف متعین کریں۔ ہر مسئلہ میں اپنی سوچی سمجھی رائے ان کا امتیاز تھا۔ وہ اپنی بات دلائل کی بنیاد پر رکھتے تھے۔ لوگوں کی باتیں غور سے سنتے اور اپنی بات سلیقہ سے رکھتے۔ ان کو ان کے طے شدہ موقف سے ہٹانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

مولانا کثیر المطالعہ شخص تھے۔ ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ مطالعہ انھوں نے کر رکھا تھا۔ وہ عالم دین تھے۔ کتاب وسنت پر گہری نظر تھی۔ فقہی امور ومسائل کے بارے میں کافی معلومات رکھتے تھے۔ تحریکی لٹریچر کا مطالعہ کافی عمیق تھا۔ مذاہب پر ان کا مطالعہ کافی اچھا تھا۔ ہندو دھرم پر وہ خاص طور پر تیار تھے۔

حالات حاضرہ پر بھی ان کی نظر بہت گہری تھی۔ صبح درس قرآن کے بعد پابندی کے ساتھ اخبارات کا مطالعہ کئی گھنٹے کرتے۔ ہم جیسے لوگ تو صرف سرخیوں پر اکتفا کر لیتے یا بعض خبریں تفصیل سے پڑھتے ہیں لیکن وہ تقریباً ہر خبر اور تجزیہ بغور پڑھتے۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی سیاست، سیاسی، ملی اور ملکی جماعتوں اور افراد پر ان کی گہری نظر تھی اور ان کا تجزیہ اکثر اوقات درست ہوتا۔ اس ضمن کے مختلف امور ومسائل میں ہم لوگ مولانا سے

اہتمام کے ساتھ رجوع کرتے۔

مولانا طارق صاحب کو ہومیوپیتھی سے بہت شغف تھا۔ ہومیوپیتھی کی بہت ساری کتابیں ان کے پاس تھیں۔مختلف لوگوں کو دوائیں بھی تجویز کرتے تھے۔ان کے پاس ہومیوپیتھی دوائیں اس قدر تھیں کہ دفتر حلقہ میں آنے والے بعض مہمان ان کو ڈاکٹر سمجھتے تھے۔ ویسے وہ ایک حد تک ڈاکٹر بھی تھے۔ تجربہ کی روشنی میں یونانی اور ہومیوپیتھی کے بہت سارے نادر نسخے ان کے پاس موجود تھے۔ جس سے لوگوں کو شفاء ہوتی۔ ہومیوپیتھی کی دواان کو بہت سوٹ کرتی۔ وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میرا جسم ہومیوپیتھی کیلئے ہی بنا ہے۔ جب کہ مجھ جیسے لوگوں کو بڑی مشکل سے شاید ہی ہومیوپیتھی کی کوئی دوا فائدہ کرتی ہو۔

ان کی زندگی کا ایک اہم پہلوان کی مزاجی کیفیت تھی۔لوگوں کو اس سلسلے میں ان سے شکایت رہتی تھی۔بعض لوگ تو ان سے بہت گھبراتے تھے۔اصل بات یہ تھی کہ وہ جس چیز کو صحیح سمجھتے تھے اس کو برملا اور بے لاگ کہہ دیا کرتے تھے۔قطع نظر اس کے کہ اس سے کسی کو تکلیف ہوگی یا خوشی یا اس سے نفع ہوگا یا نقصان۔ جب ان کو احساس ہوتا تو فوراً معافی بھی مانگ لیتے۔ایک خاص بات یہ تھی کہ ان کے سامنے اگر کوئی اپنی علمی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتا تو اسے وہ ہرگز نہیں بخشتے تھے۔اپنی غلطی اور کمی کو تسلیم کرنے کے بجائے اگر کوئی اس کی تاویل کرتا یا اس پر اصرار کرتا تو وہ سخت لہجے میں اس سے پیش آتے۔ہم میں سے کون ہے جس کے اندر کمیاں نہیں ہیں، بے عیب تو اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔یہ کمی اب ان کے انتقال کے بعد مجھے خوب محسوس ہوتی ہے کہ اکثر لوگ مصلحتوں کے شکار نظر آتے ہیں۔کوئی صحیح بات بھی اس خوف سے نہیں کہہ پاتا کہ کہیں اس کا کچھ نقصان نہ ہو جائے۔ ویسے وہ اپنے جماعتی بزرگوں اور ذمہ داران کا بہت ادب کرتے تھے اور اپنے ماتحت لوگوں سے شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے۔طارق صاحب اپنی اس مخصوص مزاجی کیفیت کی وجہ سے جماعتی حلقہ میں بہت دور دور تک مشہور تھے۔وہ کسی مجلس میں پہنچتے تو ہلچل مچ جاتی۔لوگ مسکرانے لگتے۔جماعتی رفقاء بھی ان سے کافی محبت کرتے تھے۔ ہمارے یہاں یہ بات بطور مزاح مشہور ہوگئی تھی کہ کوئی فرد اگر جماعتی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا یا اس سے لاپرواہیوں کا صدور ہوتا اور توجہ دہانی کے بعد بھی خاطر خواہ اصلاح حال نہیں کرتا تو اس سے کہا جاتا کہ ''سنبھل جاؤ ورنہ طارق صاحب کو بھیج دیں گے'' اور طارق صاحب بھی محظوظ ہوتے۔

شعروسخن کا ایک صاف ستھرا ذوق ان کو میسر تھا۔وہ اردو ادب کے طالب علم تھے۔استاد شعراء کے کلام انھیں یاد تھے۔اجتماعات کے موقع پر چھوٹی بڑی ادبی نشستوں کا اہتمام کرواتے۔اچھے اشعار کا احترام کرتے اور واجبی قسم کے اشعار پر تفریحی ہوٹنگ بھی کرتے تھے۔اکثر لوگوں کو ان کا انداز داد بہت پسند آتا تھا۔بعض لوگوں کو ناگوار بھی گزرتا۔اس سلسلے میں ان کے مؤیدین ومداحین ملک کے طول وعرض میں کثرت سے موجود ہیں۔ایسے مواقع پر ان کی یاد بہت ستائے گی۔

مولانا طارق فارقلیط صاحب تقریباً 25/سال سے شوگر کے مریض تھے۔ بلڈ پریشر، دل کی بیماری اور گال

بلیڈر میں پتھری وغیرہ نے انھیں گزشتہ کئی سالوں سے پریشان کر رکھا تھا۔ان کا ایمان اللہ تعالیٰ پر بہت گہرا تھا۔وہ بےخوف رہا کرتے۔بیماری سے کبھی نہیں گھبراتے۔البتہ محتاط رہتے اور دوائیں بالکل وقت پر لیتے،کافی منضبط زندگی گزارتے۔بیماری کے باوجود وہ جماعت کے کاموں میں کوئی کمی نہیں واقع ہونے دیتے۔میٹنگوں کے موقع پر کام کا کافی باران کے اوپر ہوتا لیکن انھوں نے کبھی بھی بیماری کا عذر نہیں کیا۔بسا اوقات لمبے لمبے سفر بھی کرتے۔جماعت کے لئے ہمیشہ متفکر رہتے۔وہ جماعت کی مجلس نمائندگان اور حلقہ کی مجلس شوریٰ کے کئی میقاتوں سے رکن چلے آرہے تھے۔ان کا گھرانہ بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا تھا۔لیکن جماعت میں آنے کے بعد انھوں نے اپنے متعلقین کی اصلاح کی۔ان کو اس سلسلے میں کافی دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

جب وہ دہلی چیک اپ کے لئے گئے تو ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ آپ جتنی جلد ممکن ہو آپریشن کروالیں۔اس لئے کہ ان کے دل کی چاروں اہم رگیں متاثر تھیں۔انھوں نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے کہا مولانا آپ ڈاکٹر کے مشورہ پر عمل کریں اور فوراً آپریشن کروالیں۔لیکن انھوں نے کہا کہ نظماء کی میٹنگ ہے۔اس کے بعد شوریٰ کا اجلاس ہے۔میں رپورٹ وغیرہ مرتب کرکے اور سالانہ گوشوارہ بنواکر نیز دیگر کام نپٹا کر شوریٰ کے بعد آپریشن کرواؤں گا۔میرے اصرار پر بھی وہ نہیں مانے اور کام مکمل کرکے وہ آپریشن کیلئے دہلی گئے۔مئی 2014ء میں اسکارٹ ہاسپٹل میں الحمدللہ ان کا کامیاب آپریشن ہوا۔کچھ دن وہ مرکز دہلی میں مقیم رہے پر ڈاکٹر کے مشورے سے گھر چلے گئے۔بفضلہ تعالیٰ ان کی صحت کافی تیزی کے ساتھ بہتر ہو رہی تھی۔آپریشن کو تقریباً ڈھائی ماہ ہوگئے تھے۔رمضان المبارک میں وہ دفتر حلقہ بھی تشریف لائے تھے۔کچھ دفتری کام بھی انھوں نے انجام دیا۔وہ اپنی صحت کے تعلق سے بہت خوش تھے۔بظاہر ان کو دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کا آپریشن ہی نہیں ہوا ہے۔24/جولائی 2014ء کو وہ لکھنؤ سے گھر گئے۔گھر بھی ہشاش بشاش تھے۔افطار کی تقسیم اور غرباء ومساکین کی امداد میں لگے ہوئے تھے کہ 28/جولائی 2014ء کی رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے اچانک ان کی حالت خراب ہوئی اور ایک بجے ان کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔جس کو جہاں اطلاع ہوئی پریشان ہوگیا۔تدفین دن میں دو بجے طے ہوئی۔رمضان کا آخری دن تھا۔اگلے روز عید متوقع تھی۔جماعتی احباب کی عید پھیکی ہوگئی۔بڑی تعداد میں لوگ ان کے جنازے میں شریک تھے۔تقریباً دوتہائی افراد جماعت ہی کے تھے۔پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں۔اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے،پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے،ان کے مسائل حل کرے اور جماعت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔آمین۔

حلقہ یوپی مشرق نے ایک قیمتی ہیرا کھودیا

مولانا محمد عمران فلاحی، استاذ جامعۃ الفلاح وناظم ضلع جماعت اسلامی ہند اعظم گڑھ

مولانا محمد طارق فارقلیط فلاحی مرحوم میرے ان شاگردوں میں سے تھے جن پر مجھے ناز ہے۔ مرحوم دوران طالب علمی سے ہی طلبہ میں نمایاں نظر آتے اور دوران درس فقہ نیز دیگر مضامین کی گھنٹیوں میں ایسے سوالات کرتے جس سے اندازہ ہوجاتا کہ مرحوم زیر درس مضامین کا باقاعدہ مطالعہ کرکے آتے ہیں۔

موصوف شروع ہی سے SIO سے وابستہ ہوگئے تھے اور اس کے تاسیسی ممبر تھے۔ مرحوم نے تحریک اسلامی کو اپنا اوڑھنا وبچھونا بنالیا تھا۔ تاحیات اس پر قائم بھی رہے۔ آپ پر SIO کی ذمہ داری بہت دنوں تک رہی اور آپ نے حیات نو ورفیق منزل کی ادارت بھی کی۔ کچھ دنوں تک کرناٹک میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ان ایام میں بھی تحریک کے کام کرتے رہے۔

ان کی تحریر ایسی نمایاں اور پختہ تھی کہ ٹائپ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ حلقہ کی رپورٹ خواہ ششماہی ہو یا سالانہ اپنی تحریر میں پیش کرتے، کہیں بھی کوئی کٹ کا نشان نظر نہیں آتا۔

مرحوم ہر کام سلیقہ سے انجام دیتے، چاہے حلقہ کے کام ہوں یا ریلیف کے، یا دیگر امور ہوں، ہر جگہ آپ کے کام میں سلیقہ نظر آتا۔

دفتر حلقہ کی ہر چھوٹی بڑی چیز پر نگاہ رکھتے اور ہر ایک کے لیے آپ مرجع ہوتے، ہر چھوٹے بڑے کام کے سلسلہ میں لوگ آپ کی طرف رجوع کرتے۔ آپ ہر مسئلہ کا حل منٹوں میں پیش کردیتے۔

حلقہ اترپردیش کے پورے حلقہ پر ان کی نگاہ تھی۔ ہر ایک سے ربط رکھتے۔ وقتاً فوقتاً رفقاء جماعت کو مشورہ بھی دیتے رہتے۔

آپ اپنی رائے دلائل کی روشنی میں پیش کرتے بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی مسئلہ پر ہاؤس کی رائے تقریباً ایک ہوگئی مگر جب ان کی باری آئی تو اپنی بات دلائل کے ساتھ ایسے انداز میں پیش کی کہ ہاؤس نے اپنی رائے سے رجوع کرتے ہوئے ان کی رائے کو ترجیح دی۔

ایک جنرل سکریٹری کے اندر جس طرح کی صلاحیتیں ہونی چاہیے موصوف کے اندر تقریباً وہ تمام صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ مطالعہ کافی وسیع تھا، اس لیے ہر طرح کے مواقع پر لوگ ان سے رجوع

کرتے۔ میں نے خود جماعت کے مسائل کے ساتھ ساتھ اپنے نجی مسائل پر بھی وقتاً فوقتاً ان سے مشورہ لیا۔ آپ کے مشورہ کے بعد مجھے شرح صدر ہو جاتا اور اس پر عمل کرنے میں مجھے کوئی تأمل نہیں ہوتا۔

اجتماعی سفر کے دوران بھی آپ سے استفادہ کا موقع ملا، اس موقع پر بھی آپ ہر رفیق کا برابر خیال رکھتے، کھانے پینے کے سلسلہ میں برابر دریافت کرتے رہتے۔ دوا بھی ساتھ رکھتے اگر کسی رفیق کو ضرورت پڑتی تو فرسٹ ایڈ کے طور پر فوراً دوا کھلاتے۔

محمد طارق فارقلیط صاحب علم دوست تھے آپ نے جامعۃ الفلاح کی عالمیت وفضیلت کی سندوں پر ہی اکتفاء نہیں کیا، بلکہ یونیورسٹی سے ڈگریاں بھی حاصل کیں۔

مرحوم نے ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کی، شوگر وغیرہ کی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے باوجود جماعت کے کاموں میں برابر لگے رہے۔ کوئی کمی واقع ہونے نہیں دیتے۔ نظماء علاقہ اور شوریٰ کے اجلاسوں کے موقع پر کام کا کافی بوجھ رہتا مگر کبھی بھی آپ نے بیماری کا عذر نہیں کیا۔

آپ پورے حلقہ میں معروف ومشہور اور ہر دلعزیز تھے، اسی لیے تو آپ کئی میقاتوں سے مجلس نمائندگان وحلقہ کی شوریٰ کے رکن چلے آ رہے تھے، اور آخری سانس تک اس کے رکن رہے۔

آپ ۲۹؍رمضان المبارک تقریباً ایک بجے رات اس دار فانی سے کوچ کر گئے ''انا للہ وانا الیہ راجعون''۔ جس کی اطلاع جناب مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی، امیر حلقہ اتر پردیش مشرق نے ایک بجے شب میں دی۔ اچانک اس حادثہ کی خبر سن کر دل بے چین ہو گیا۔ تدفین کا وقت معلوم کر کے صبح سویرے مقامی رفقاء کے ساتھ تدفین میں شرکت کے لیے روانہ ہو گیا۔ مرحوم کے گھر پہونچنے کے بعد پتہ چلا کہ ابھی ان کا لڑکا 'مبشر' دہلی سے نہیں آ سکا۔ لڑکے کے آنے کے بعد مرحوم کے غسل کا عمل شروع ہوا چونکہ آپ کا گھرانہ بریلوی مکتبہ فکر کا تھا، اور آپ نے اپنے گھر والوں کی اصلاح کر لی تھی، مگر ٹولہ محلّہ ودیگر حضرات اسی خیال کے تھے، اس لیے غسل وغیرہ میں بھی وہی طریقہ اپنانے کی کوشش کی، مگر میں نے خود ان امور میں عملی حصہ لیا اور ان کے متعلقین کو سمجھا بجھا کر جملہ امور سنت نبوی کے مطابق انجام دیئے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کے لغزشوں کو معاف فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور جماعت اسلامی کو نعم البدل عطا فرمائے، آمین

آہ! طارق بھائی

ڈاکٹر ضیاء الرحمن فلاحی مدنی، الجامعۃ الاسلامیہ شانتاپرم کیرلا

غالبا غالبا ۱۹۷۸ء-۱۹۷۹ء کی بات ہے، فلاح میں عالمیت کے آخری سال کا طالب علم تھا، اور طارق بھائی فضیلت کے آخری سال میں تھے۔ جامعہ میں طلبہ ہاسٹل میں کچھ مشکلات ومسائل کا سامنا کر رہے تھے۔ ناظم اور صدر مدرس دونوں سے بارہا شکایت کے باوجود ان کی پریشانیاں باقی تھیں۔ دوسری طرف صدر مدرس اور ناظم ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے۔ اسی اثناء میں ناظم صاحب نے فضیلت کے طلبہ کے ساتھ ہاسٹل میں جا کر میٹنگ کی۔ ان کا مقصد تھا کہ صدر مدرس کے سلسلے میں طلبہ کی رائے حاصل کریں۔ اس کے لیے انہوں نے استصواب رائے کی تجویز رکھی۔ طلبہ کو گرچہ یہ بات پسند نہ تھی، لیکن وہ جامعہ کے سب سے بڑے ذمہ دار کے سامنے منھ کھولنے کی جرأت نہیں کر پا رہے تھے۔ اس وقت طارق بھائی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا کہ ''ناظم صاحب پہلے آپ اپنے بارے میں استصواب رائے کرا لیجئے، تب کسی اور کے بارے میں کرایئے گا۔ اس واقعے کو ذکر کرنے کا مقصد طارق بھائی کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالنا ہے کہ وہ جس بات کو حق جانتے تھے، اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ وہ لاگ لپیٹ کے آدمی نہ تھے۔ میں نے پانچ سال تک فلاح کے کیمپس میں ان کو دیکھا اور سنا، میں ان سے ہر اعتبار سے چھوٹا تھا، اور ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ طارق بھائی کے بیچ میں بڑے ہی لائق وفائق طلبہ تھے۔ عبیداللہ، حافظ احسان الحق، مزمل حسین، غلام رسول اور امین الہدی وغیرہ، سب ایک پر ایک تھے۔ استاذ محترم مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی نے اسی بیچ کے تین طلبہ کو خصوصی القاب سے نوازا تھا۔ عبیداللہ کو فہد، مزمل کو صقر، اور طارق کو فارقلیط کے القاب دیئے تھے، جو آگے چل کر ان کے نام کا جز اور ان کی شناخت بن گئے۔

وہ مطالعہ کے شوقین، سنجیدہ اور محنتی طالب علم تھے، ان کی تقریر اور تحریر دونوں میں بڑا وزن اور اخلاص ہوتا تھا۔ اپنے طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے ''لوٹا'' پر کوئی انشائیہ لکھا تھا، جس کو کافی سراہا گیا تھا۔ جس سے ان کی مضمون نگاری اور انشاء پردازی کی صلاحیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر وہ حیات نو اور رفیق منزل کے ایڈیٹر بھی ہوئے۔

جامعہ سے فراغت کے بعد میرا ان سے طویل عرصے تک رابطہ منقطع رہا، جب میں ۱۹۸۸ء میں سعودی عرب سے اپنی تعلیم مکمل کر کے ہندوستان واپس آیا، **(بقیہ صفحہ ۱۰۷/پر)**

فارقلیط صاحب ایک منفرد انسان تھے

انعام اللہ فلاحی، شعبہ تعلیمات مرکز جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

مولانا طارق فارقلیط فلاحی رحمہ اللہ جامعۃ الفلاح کے ان خوش بخت فارغین میں سے ایک ہیں جنھوں نے تعلیم سے فراغت کے بعد ہی تحریکی دعوتی کاموں کو اپنا میدان کار بنایا۔ان کی سعادت یہ بھی ہے کہ آخری لمحہ تک اسی کام میں یکسوئی کے ساتھ لگے رہے۔اللہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، آمین

میں جامعۃ الفلاح میں طالب علم تھا اس وقت طارق فارقلیط صاحب حیات نو کے مدیر کی حیثیت سے جامعۃ الفلاح آئے۔ وہ SIO کے ممبر بھی تھے اس وجہ سے ان سے قریبی تعلق رہا، وہ بعد میں SIO حلقہ اتر پردیش کے صدر حلقہ ہوئے ان کے بعد والی میقات میں میں صدر حلقہ منتخب ہوا، اس طرح دفتر حلقہ جماعت اسلامی ہند اتر پردیش مولوی گنج میں ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، ان دنوں دفتر میں مطبخ (میس) نہیں تھا، ہم دونوں ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے، اور رہائش بھی ایک ساتھ تھی، کوئی ڈیڑھ سال تک ساتھ رہا۔ طارق صاحب سابق صدر حلقہ تھے اس پہلو سے ان کی شفقت اور رہنمائی مجھے حاصل تھی، میقات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بغرض تعلیم میں سعودی عرب چلا گیا تقریباً دس سال کے بعد بحیثیت صدر مدرس جامعہ مصباح العلوم چوکونیاں آیا تو انھوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنے بچے مبشر کے بارے میں یہ بات تھی کہ وہ ان دنوں ''کھونپا'' الہ آباد میں ہے میں چاہتا ہوں کہ تمہاری سر پرستی میں اس کو دے دوں، مبشر کا داخلہ درجہ ہفتم میں ہوا اور عالمیت انھوں نے مصباح العلوم سے مکمل کی۔

طارق صاحب کے مزاج میں انفرادیت تھی، کم گو تھے، مزاج کے سخت تھے، ان کے تبصرے بغیر کسی رو رعایت کے شدت لیے ہوئے ہوتے تھے۔ جو دل میں ہوتا تھا کہہ دیتے تھے۔لیکن ان کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دل کے انتہائی صاف تھے جو بھی بات ہوتی تھی اس کو دل میں نہیں رکھتے تھے۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جامعہ مصباح العلوم میں بعض مسائل پیدا ہو گئے تھے، امیر حلقہ یوپی مشرق مولانا ولی اللہ سعیدی صاحب ایک ٹیم کو لے کر وہاں پہنچے، طارق فارقلیط صاحب بھی تھے، وہ سبھی لوگوں سے ملاقات کر رہے تھے۔ مجھ سے ملاقات کے وقت انہوں نے نہایت ہی سختی کے ساتھ بات کی۔ یہاں تک کہ میں کمرے سے باہر چلا آیا۔ پھر دوسرے دن جب ان کو میں نے مولانا عمران فلاحی اور عبدالرافع صاحب کے سامنے یاد دلایا کہ طارق صاحب ہمارے

تعلقات کی نوعیت حاکم محکوم کی نہیں ہے بلکہ اخوت ومحبت کی بنیاد پر ہے،کل آپ نے جس لہجہ میں بات کی ہے اس سے مجھے شدید تکلیف پہونچی ہے،انھوں نے برجستہ کہا کہ مجھے اس کا افسوس ہے میں اس وقت بہت الجھن میں تھا آپ سے پہلے ایک صاحب سے بات ہورہی تھی اس وجہ سے میرا بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا،انھوں نے کہا کہ مجھے معاف کردیجئے۔

ابھی دل کے آپریشن کے لیے دہلی آئے تھے یہاں بھی انھوں نے اس کے لیے دوبارہ معافی چاہی اور کہا کہ بڑا آپریشن ہے معلوم نہیں دوبارہ ملاقات ہوگی یا نہیں۔

یہ ان کی عظمت اور بڑائی کی دلیل ہے۔اللہ ان کی کمزوریوں کو معاف فرمائے اور درجات کو بلند فرمائے۔ اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔آمین۔

بقیہ: آہ! طارق بھائی

اور مشیئت الٰہی نے مجھے کرناٹک کے پرفضا مقام 'ہاسن' میں قائم تحریک اسلامی کی درسگاہ اسلامیہ عربک کالج منصورہ پہنچا دیا،تو مجھے معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے ہاسن کی سرزمین پر، جبکہ یہ ادارہ قائم بھی نہیں ہوا تھا، دو فلاحی حضرات اپنی یادوں کے انمٹ نقوش چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ ہاسن شہر میں مولانا اسماعیل فلاحی صاحب اور ہاسن ضلع ہی کے ایک مقام 'ارے ہلی' میں طارق فارقلیط فلاحی۔دونوں نے دینی، تعلیمی، تربیتی اور دعوتی میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں، اور جامعہ کا اپنے قول وعمل سے بہترین تعارف کرایا۔طارق بھائی سے میری اگلی ملاقات وہیں منصورہ میں اس وقت ہوئی جب وہ دوبارہ کسی کام سے یا پروگرام میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے ہوئے تھے۔اس ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ وہ کرناٹک کے ایک اور مقام 'سورب' میں بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ارے ہلی اور سورب میں انہوں نے اپنی جوانی کے قیمتی ایام لگائے۔انہوں نے دکنی زبان میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔وہ اتنی روانی اور صفائی سے دکنی بولتے تھے کہ کوئی تمیز ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ان کا تعلق یوپی سے ہے یا کرناٹک سے۔طارق بھائی اپنی شیریں بیانی سے نوجوانوں کا دل موہ لیتے تھے، ان کے گفتار وکردار سے متأثر ہوکر وہاں کے نوجوان ان کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ان کے کردار پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ان کا عمل ابوالمجاہد زاہد کے اس شعر کا مصداق تھا ؎

جادہ جادہ چھوڑ جاؤ اپنی یادوں کے نقوش
آنے والے قافلوں کے رہنما بن کر چلو

دعا ہے کہ اللہ تعالی مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کی بے لوث خدمات کا بھرپور صلہ جنت الفردوس کی شکل میں عطا کرے، آمین

میرے ابو

مبشر احسن فلاحی، نئی دہلی۔ موبائیل نمبر 9871309446

(ذیل میں مرحوم مولانا طارق فارقلیط فلاحی کے صاحبزادے کے اپنے والد بزرگوار کے تعلق سے کچھ احساسات پیش ہیں، برادر مبشر نے جامعۃ الفلاح سے فضیلت کے بعد الجامعہ الاسلامیہ شانتاپرم کیرلا سے تخصص فی القرآن الکریم کیا، فی الحال وہ معاش اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم کے سلسلے میں دہلی میں مقیم ہیں۔ ***مدیر****)*

اس دن میں عید کی مناسبت سے گھر جا رہا تھا اور بہت خوش تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ اور میں اپنے بہنوں کے لیے بہت سارا سامان گھر لے جا رہا تھا۔ کچھ سامان ابو کو گفٹ کرنے کے لئے بھی خرید لیا تھا۔ مگر جب ٹرین کانپور پہنچی تو گھر سے اچانک فون آیا کہ ابو کا انتقال ہو چکا ہے۔

دو مہینے پہلے میں نے ابو کا فورٹیس اسکارٹ ہرٹ میں دل کا آپریشن کرایا تھا۔ جس میں ان کے دل کی چار رگوں کو تبدیل کیا گیا تھا۔ اور ان کی صحت کافی اچھی ہو گئی تھی۔ تمام لوگ تقریبا مطمئن ہو گئے تھے مگر اللہ تعالی نے صحیح فرمایا ہے:

ولا تدری نفس بأی ارض تموت۔

میں ابو کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا؛ انھوں نے زندگی میں کبھی کسی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ سب سے بڑا کارنامہ ان کا یہ تھا کہ انھوں نے مجھے دین کی بہت ہی اچھی تعلیم دی اور ایک ایسی فکر دی جو آج ہندوستان کے بہت ہی کم اداروں میں ملتی ہے۔

میں دہلی میں چار سال سے رہ رہا ہوں۔ ابو کا اکثر مرکز میں جماعت کے سلسلے میں آنا جانا رہتا تھا۔ اور میں ہمیشہ ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے پوچھتے تھے کہ تم جماعت کے لوگوں سے کیوں نہیں ملتے ہو۔ بعض لوگوں کے نام لے کر وہ مجھ سے ملنے کے لئے کہتے تھے۔ جیسے مولانا اعجاز اسلم صاحب سکریٹری شعبہ میڈیا، مولانا رفیق قاسمی صاحب سکریٹری شعبہ اصلاح معاشرہ، جناب محمد احمد صاحب سکریٹری ملی وملکی مسائل، اور جناب مولانا نصرت علی صاحب جنرل سکریٹری جماعت اسلامی ہند سے۔ اگر میری موجودگی میں وہاں کوئی آ جاتا

تھاتو اس سے میرا تعارف ضرور کراتے تھے۔

ابو مجھ سے ہمیشہ کہتے تھے جماعت ایک پریوار کی طرح ہے۔جس طرح ہمارا گھر ایک پریوار ہے اسی طرح جماعت بھی ہے،فرق یہ ہے کہ ہمارا گھر ایک چھوٹا پریوار ہے اور جماعت ایک بڑا پریوار ہے۔

میرے ابو بہت ہی ایماندار؛کم گو اور نڈر انسان تھے۔گھر پر بھی وہ اکثر خاموش ہی رہتے تھے۔اس بات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ کھانے کے وقت جب ہم کھانا لگانے کے لئے پوچھتے تھے۔تو اگر وہ خاموش رہتے تو ہم سمجھ جاتے تھے کہ ابھی نہیں کھائیں گے،بعد میں وہ خود ہی کھانے کے لئے کہتے تھے۔

میں نے اپنی پوری زندگی میں امی اور ابو کے درمیان کبھی تیز آواز میں گفتگو ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، میری امی ابو کی بہت ہی عزت کرتی تھیں اور ابو بھی ہر چھوٹی بڑی چیز کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔

ایک بار میں نے جبکہ غالباً عربی دوم میں تھا ان سے ان کی تنخواہ کے بارے میں پوچھا،تو انھوں نے کہا کہ تمہارا خرچہ پورا نہیں ہوتا تو میں بڑھا دوں گا۔اس کے بعد میں نے کبھی اس بارے میں بات نہیں کی۔

جب میں چوکونیاں میں پڑھتا تھا تو وہ مجھ کو دوسو روپئے مہینہ خرچ دیتے تھے اور جب میں جامعۃ الفلاح میں آیا تو ہر مہینے میرا خرچ تین سو روپئے کر دیا تھا،اور یہ سلسلہ آخر تک چلتا رہا۔

میرا پورا خاندان بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا۔مگر تمام لوگ ابو کی بہت ہی عزت کرتے تھے۔اور اپنے مسائل اور معاملات حل کرانے کے لئے ابو ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ابو جب لکھنو سے گھر آتے تھے تو لوگ ملاقات کے لیے بھیڑ لگا لیتے تھے۔گاؤں میں بھی ان کی بہت عزت تھی۔

میرے ابو اور امی نے میرے دادا اور دادی کی بہت زیادہ خدمت کی۔اور آخر وقت تک ان کا خیال رکھا۔ آج بھی گاؤں والے ابو اور امی کی مثال دیتے ہیں۔

میرے ابو سات بھائی تھے اور ان کی تین بہنیں تھی،جن میں سے پانچ بھائیوں کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔

میرے ابو ہمیشہ مجھ سے نماز کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے اور کہتے تھے کہ زندگی گزارنے کے لئے بہت زیادہ کمانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔کیونکہ جو لوگ بہت زیادہ مالدار ہیں وہ لوگ بھی وہی کھاتے ہیں جو ہم لوگ کھاتے ہیں،اور زندگی کی بنیادی ضرورتیں تو بہت ہی سستی اور آسان ہیں۔

میرے ابو بتاتے تھے کہ انھوں نے کبھی زندگی میں فلم نہیں دیکھی ؛مگر انہیں فلمی دنیا کے بارے میں کافی معلومات تھیں،اور حالات حاضرہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔وہ کرکٹ بھی نہیں دیکھتے تھے مگر تمام کرکیٹروں کے بارے میں بہت تفصیلی معلومات رکھتے تھے،مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ان کے پاس بھوجپوری فلموں کے بارے میں بھی کافی معلومات تھیں۔

ہمارے گھر میں کسی کی طبیعت خراب ہوتی تھی تو ہم لوگ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے تھے بلکہ ابو کو فون

کرتے تھے اور وہ جو دوا وہ تجویز کرتے تھے اس سے ہی ہم لوگ ٹھیک ہو جاتے تھے۔ ہمارے گھر میں ایک الماری صرف ہومیو پیتھک دواؤں سے بھری ہوئی ہے۔

میں نے ابو کو کبھی پریشان ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، بڑی سے بڑی مصیبت بھی وہ آسانی سے برداشت کر لیتے تھے۔

اللہ پر ان کا ایمان بہت ہی پختہ تھا۔ سخت بیماری کے زمانے میں بھی وہ بہت ہی مطمئن رہتے تھے۔

ابو کے اندر لوگوں کو پہچاننے کی زبردست صلاحیت تھی۔ جس سے ایک بار مل لیتے تھے اس کے بارے میں تقریباً بہت ساری باتیں بتا دیتے تھے۔

جب میں ان کی بیماری کو لے کر کافی پریشان ہو جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ڈرامت کرو۔ جب موت ہو گی تو خود بخود آجائے گی۔

وہ جینس پہننے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے، ایک بار مجھے میرے ایک دوست نے جینس گفٹ کیا جس کو دیکھ کر کافی غصہ ہو گئے اور کہنے لگے ایسے کپڑے مت پہنا کرو جسے مرد اور خواتین یکساں استعمال کرتے ہیں۔

ابو مجھ کو سنجیدہ رہنے کے لیے ہمیشہ تلقین کرتے رہتے تھے، کیونکہ میں ہمیشہ گھر میں ہنستا اور ہنسا تا رہتا تھا۔

بابری مسجد کی شہادت کے وقت ابو لکھنؤ دفتر میں تھے اور جماعت کے بعض ساتھیوں کے ساتھ انھیں بھی جیل جانا پڑا تھا۔

جیل کا ایک واقعہ بتاتے تھے کہ جب انھوں نے جیل کا کھانا کھانا شروع کیا تو پہلے ہی لقمہ میں ایک کنکر دانت کے نیچے آ گیا، دوسرے لقمہ میں بھی جب ایسا ہی ہوا تو کہتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ جیل کا کھانا بغیر چبائے ہی کھانا چاہیے اور پھر پورا کھانا بغیر چبائے ہی کھانا پڑا۔

میرے ابو میری بہنوں کو بہت زیادہ پیار کرتے تھے، اور میرے مقابلہ میں ان کی باتیں زیادہ مانتے تھے۔ جبکہ ابو کے دوست بتاتے تھے کہ مولانا تمہارے بارے میں کافی فکر مند رہتے ہیں اور وہ تم سے بہت زیادہ پیار کرتے ہیں۔

آج جبکہ ابو ہمارے درمیان نہیں ہیں، بہت ہی شدت سے ان کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے اور ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام دے، آمین

ہمارے مربی۔۔۔ ہمارے محسن

طیب احمد بیگ، معاون مدیر ماہندی ہنامہ 'چھاترومرش'

۲۹ ررمضان ۱۴۳۵ھ کی سحر اپنے آغوش میں ایک ایسا سانحہ لے کر آئی، جس نے یک لخت میرے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ شب قدر کی تلاش کے لیے بنائے گئے معمول کو اس رمضان المبارک میں آخری بار ادا کر کے جب میں سحری کے لیے دسترخوان پر بیٹھا، عین اسی وقت میرے دیرینہ رفیق برادرم نجم الثاقب فلاحی (صدر حلقہ، ایس آئی او یو پی سنٹرل) نے SMS کے ذریعہ اطلاع دی کہ مولانا طارق فارقلیط فلاحی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ سحر کے آغوش میں مخفی اس اندوہناک خبر نے یک لخت میرے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ قلب و ذہن اس خبر کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے تاہم اس نہ ہونے والی 'غلط فہمی' کو پھر بھی رفع کرنے کے لیے برادر موصوف کو کچھ لمحوں کے حیران کن توقف کے بعد فون لگایا، اس دعا کے ساتھ کہ خدا کرے یہ خبر بالکل غلط ہو، لیکن مشیت ایزدی کے آگے کسی کا بس نہیں۔

مرحوم سے میرا تعلق ۲۰۱۰ء کے اواخر میں ہوا، جبکہ میں حلقہ یو پی سنٹرل کے پہلے ممبرس کیمپ میں شرکت کے لیے لکھنؤ میں واقع دفتر حلقہ 'دارالاسلام' گیا تھا۔ اس کے بعد ایس آئی او حلقہ یو پی سنٹرل کی پہلی میقات (سال ۲۰۱۱-۲۰۱۲ء) میں میرا تقرر آرگنائزنگ سکریٹری کے طور پر ہو گیا، جہاں میں نے مولانا کے شب و روز کا بہت ہی قریب سے مشاہدہ کیا۔ ان ایام میں میں نے ان کی زندگی کے جن پہلوؤں کا مشاہدہ کیا، اس کو میں اپنی اس تحریر میں مختصراً پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

۲۰۱۰ء کے اس پروگرام میں پہلے روز ہی بعد نماز فجر معمولاً تذکیر کے وقت مولانا نے اس وقت موجود سبھی رفقاء سے فرداً فرداً تعارف حاصل کیا، میرا تعارف سن کر انہوں نے سرزمین شاہ آباد کے بارے میں ماضی کی تحریکی جدوجہد کے بہت سے واقعات سے مستفید فرمایا۔ اس پورے پروگرام کے دوران مولانا انفرادی طور پر شرکاء سے ملتے رہے اور ان کے ساتھ وقت بھی گزارتے اور انہیں نصیحتیں بھی کرتے، اور یہ صرف اس پروگرام میں ہی نہیں بلکہ یو پی سنٹرل کی پہلی میقات کے کیمپ اور پروگراموں میں بھی میرا یہی مشاہدہ تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نوجوانوں سے کتنا لگاؤ رکھتے تھے۔

مولانا جماعت اسلامی ہند کی طلبہ تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (SIO) کے لیے

انتہائی فکر مند رہتے تھے۔ مولانا مرحوم کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ایس آئی او کے توسیع و استحکام میں صرف ہوا۔ مولانا مرحوم نے اپنے دور شباب میں ہی ایس آئی او سے وابستگی اختیار کر لی تھی اور حلقہ اتر پردیش (اس وقت یہ حلقہ، اتر پردیش، دہلی و ہریانہ ریاستوں پر مشتمل تھا۔) کی صدارت کے دوران وہ تنظیم کو متعارف کرانے اور اس کو استحکام بخشنے کی جدو جہد میں ہمہ تن مصروف رہے۔ ایس آئی او کے متعلق ان کی فکر مندی کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ مرکزی مجلس شوریٰ (CAC) کے رکن منتخب ہوئے اور ایس آئی او کے اردو ترجمان رفیق منزل کے مدیر بھی رہے۔ دوران ادارت انہوں نے رفیق منزل کو نئی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔ ان کے دور ادارت کا سب سے بڑا کارنامہ بانی امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحیؒ کی حیات وخدمات پر نکالا گیا رفیق منزل کا خصوصی شمارہ ہے جو آج دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ فکر مندی اور لگن ان کے ایس آئی او میں رہنے تک ہی محدود نہ تھی بلکہ آخری ایام تک وہ اس جواں عزائم تنظیم کے لیے قیمتی مشوروں کے ذریعے وقت کے ذمہ داران کی رہنمائی کرتے رہتے تھے۔

مولانا مرحوم کی ایک بڑی خصوصیت جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ان کا وسیع مطالعہ ہے۔ دفتر حلقہ میں اکثر بعد نماز عصر علمی مجالس لگتی تھیں، جس میں مولانا اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر مجلس کو فکر ونظر کا ایک نیا رخ دیتے تھے۔ دفتر حلقہ کے معمول کے مطابق روزانہ بعد نماز فجر تذکیر ہوا کرتی تھی، جس میں بانی تحریک مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر مولانا طارق صاحب مرحوم از خود پڑھا کرتے تھے اور اس کے بعد مولانا مرحوم اپنے گہرے مطالعے اور عملی مشاہدے کی بنیاد پر عصر حاضر سے ان آیات کے ربط و رہنمائی کی وضاحت فرماتے تھے۔

میں نے اپنے مشاہدہ کی حد تک مولانا مرحوم کو انتہائی اصول پسند پایا۔ دفتر کے اوقات کا معاملہ ہو کہ مطالعہ کا وقت، یا دیگر معمولات ہوں، مولانا نے تمام کو اصولوں اور ضابطوں کا پابند بنا کر رکھا تھا اور ان پر آخر تک کاربند رہے۔

مولانا مرحوم صحت کے متعلق بہت حساس رہتے تھے۔ مولانا Heart اور Sugar کے خطرناک امراض میں مبتلا تھے۔ لہٰذا کھانے پینے کی چیزوں میں بہت ہی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ مولانا کی یہ بیماریاں جس Level پر تھیں، اس Level پر پہنچنے کے بعد عام طور پر کوئی شخص کسی بڑے کام کو انجام دینے کے قابل خود کو نہیں پاتا، لیکن مولانا ایسی حالت میں بھی اپنے معمول کے مطابق کام انجام دیتے تھے، بیماریوں اور اس سے پیدا ہونے والی تکان کو بالکل بھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ مطبخ میں بھی ان کی پسند و ناپسند کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور مولانا ہمیشہ پرہیزی کھانے کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ مولانا کی شخصیت کی سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ وہ اپنا ذاتی کام از خود ہی کرتے تھے۔ علیل رہنے کے باوجود اپنے کپڑے خود دھوتے تھے اور اپنے دفتری کام بھی خود ہی انجام دیا کرتے تھے۔

بہر حال حلقہ میں ذمہ داری سے میری فراغت کے بعد بھی مولانا سے ربط قائم رہا، اس سال مئی میں اُن کے دل کے آپریشن کے بعد بھی مجھے مرکز جماعت اسلامی ہند میں ان کی عیادت کی سعادت حاصل ہوئی۔ افسوس کہ یہی ملاقات، جس کے بعد میں سمجھ رہا تھا کہ اب مولانا ان شاءاللہ شفایاب ہو جائیں گے، آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، مقرب بندوں میں شامل فرمائے اور انہوں نے دین کے غلبہ کے لیے اپنی زندگی جو وقف کی تھی اس کے عوض انہیں بہتر اجر سے نوازے، آمین یارب العالمین

وہ ایک خوددار قائد تھے

محمد عارف فلاحی، نئی دہلی۔ موبائیل نمبر: 9953681592

مولانا طارق فارقلیط صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات دسمبر 1999 میں بنارس علاقہ کے دفتر میں ہوئی تھی۔ شدید سردی کا موسم تھا اس حالت میں مولانا دفتری امور میں مصروف تھے۔ میں اس موقع پر ایس آئی او کے دورہ پر گیا تھا۔ ملاقات پر یہ معلوم ہوا کہ مولانا ایس آئی او کے صدر حلقہ رہ چکے ہیں، اور اُس وقت دہلی بھی یوپی کا حصہ تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی، چونکہ رمضان کا مہینہ تھا، اس لیے کھانے پینے سے متعلق کوئی معاملہ بھی نہیں تھا۔ تعارف کے فوراً بعد تنظیمی امور پر تبادلہ خیال کیا۔ چونکہ میں بالکل نیا تھا اور پہلی بار ایس آئی او کے دورے پر نکلا تھا۔ اس لیے مجھے سیکھنے اور جاننے کا بہت شوق تھا۔ مولانا نے اپنے تنظیمی سفر کی روداد سنائی اور موجودہ حالات میں کس طرح کام کیا جائے اس پر رہنمائی کی، کیونکہ ملک میں جہاں مختلف لوگ رہتے ہیں، کیمپسز میں مختلف سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں وہاں طلبہ کی ذہن سازی کرکے تحریک کا قیمتی سرمایہ بنایا جاسکے اور وہ خود ملک کی بہتری کے لیے بہترین رول ادا کرسکیں۔

کبھی کبھی مولانا جامعہ مصباح العلوم چوکونیاں بھی اپنے صاحبزادے مبشر سے ملاقات کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ اس موقع پر ایس آئی او کی طرف سے توسیعی لکچر کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ مولانا اس موقع پر تعلیم اور تحریک کے موضوع پر خصوصی گفتگو کرتے تھے اور یہ واضح کرتے تھے کہ اس ادارہ میں تعلیم حاصل کرنے کا مطلب ہی یہی ہے کہ تحریک اسلامی کا اثاثہ بننا ہے۔ ورنہ صرف تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملک میں بہت سارے ادارہ ہیں۔ بعد میں مولانا جماعت اسلامی حلقہ یوپی مشرق کے سکریٹری بنائے گئے اور میں ایس آئی او یوپی مشرق کا سکریٹری بنا۔ پھر صدر حلقہ کی بھی ذمہ داری آئی، اس دوران کافی قریب رہنے کا موقع ملا۔ تنظیمی امور میں مولانا بہت حساس تھے۔ یہاں تک کہ ایس آئی او کی میٹنگ کی روداد برائے توثیق جب ہم بھیجتے تھے اس میں تنظیمی نکات اور امور کو تو دیکھتے ہی تھے جملہ میں استعمال ہوئے الفاظ کو بھی دیکھتے تھے اور رہنمائی کرتے تھے کہ کون سا لفظ کہاں استعمال کیا جاتا ہے۔

مولانا کم گو، اور کم ملنے جلنے والے تھے لیکن جس سے ملتے تھے اور تعلق رکھتے تھے ان سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی ذاتی ضروریات اور مسائل پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ خاص طور پر طلبہ و نوجوانوں میں کچھ لوگوں سے خصوصی تعلق رکھتے تھے اور ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ مولانا حق گو اور صاف گو تھے۔ جو بات ہوتی اس کو برملا

کہتے اس میں کوئی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔حالات حاضرہ پر اچھی نگاہ رکھتے تھے، کیونکہ ہم لوگوں سے ملکی ایشوز پر مختلف موقعوں پر گفتگو کرتے تھے تو بہت ہی اہم نکات کی طرف اشارہ کرتے تھے، مثال کے طور پر سچر کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد مولانا نے تبصرہ کیا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد مسلمانوں کی بہتری ہوگی جبکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان ساٹھ سال پہلے کہاں تھا اور اب کہاں ہے، اس کا جائزہ لیا جائے اور ان کو اسی حالت پر برقرار رکھنے کے لئے منصوبہ بندی کی جائے، جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔

مولانا نے پوری زندگی تحریک کی خدمت کی اور یکسوئی کے ساتھ کی۔ کبھی کسی کے سلسلے میں شکوہ شکایت نہیں کرتے تھے جبکہ بہت سارے گھریلو مسائل میں گھرے ہوئے تھے۔ اپنے گھریلو اور ذاتی کاموں پر ہمیشہ تحریکی کاموں کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کی چند مثالیں ہیں جو میرے علم میں ہیں:

☆ کوٹلہ اعظم گڑھ میں 2005 میں جماعت کی صوبائی کانفرنس کی تیاری آخری مرحلے میں تھی۔ اجتماع کے ایک دن پہلے گھر پر کوئی ایمرجنسی معاملہ آ گیا۔ پھر بھی اجتماع کی تیاری میں لگے رہے۔ کافی اصرار کے بعد گھر گئے اور ایک دن بعد واپس آ گئے جبکہ گھر پر معاملہ ہنوز برقرار تھا۔

☆ چونکہ مولانا کافی دنوں سے دل کے مرض میں مبتلا تھے اور ڈاکٹر نے آپریشن جلدی کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے باوجود آپریشن میں تاخیر کی اور ایک ملاقات میں میں نے پوچھا کہ مولانا آپ تاخیر کیوں کر رہے ہیں تو کہا ابھی جماعت کے کئی اہم کام درپیش ہیں جس میں میرا رہنا بہت ضروری ہے۔ مثلاً حلقہ کی شوریٰ، حلقہ کا تربیتی اجتماع، نظماء کی میٹنگ وغیرہ، میں نے کہا تاخیر کی وجہ سے صحت کے زیادہ خراب ہونے کا اندیشہ ہے تو انہوں نے فرمایا ''اللہ مالک ہے''۔

☆ بہرحال آپریشن کرایا اور ڈاکٹر نے تین سے چار ماہ مستقل بیڈ ریسٹ کے لیے مشورہ دیا۔ اس کے باوجود مولانا دو ماہ بعد گھر سے دفتر حلقہ آئے وہ بھی رمضان کے مہینے میں تاکہ جماعت کا کام زیادہ متاثر نہ ہو۔ انتقال کے تین دن پہلے اتفاقاً رمضان میں دفتر حلقہ گیا۔ دیکھا مولانا کام میں مصروف ہیں۔ میں نے برملا کہا مولانا بچوں کو کیوں آزمائش میں ڈال رہے ہیں۔ آپ کو تو آرام کرنا چاہیے۔ مولانا نے فرمایا دفتری کام کے تقاضے تھے اس لیے آنا ہوا۔ آپریشن اور اس کے بعد کے مرحلے پر گفتگو ہوئی۔ ساری تفصیلات بتائی اور کہا الحمدللہ کافی آرام ہے لیکن ابھی مزید آرام کی ضرورت ہے۔ انشاءاللہ کل چلا جاؤں گا۔ اور مجھے گوشوارہ کی ایک کاپی لفافہ میں پیک کر کے دی اور کہا کہ قیم جماعت کی خدمت میں پیش کر دیجئے گا۔ اس آخری ملاقات کے ساتھ مولانا تین دن کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

جیو تو یوں کہ زندگی کو رشک آئے
مرو تو موت کہے کون مر گیا یارو